شاہ عنایت شہید

ڈاکٹر شاہ محمد مری

الارض اللہ

جھوك جنگ کا کمانڈر

شاہ عنایت شہید

عشاق کے قافلے

3

جھوک جنگ کا کمانڈر

شاہ عنایت شہید

(1655 .... 7 جنوری 1718)

ڈاکٹر شاہ محمد مری

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

کتاب: شاہ عنایت شہید

مصنف: ڈاکٹر شاہ محمد مری

پہلی اشاعت: 2011

دوسری اشاعت: 2014

قیمت: 150 روپے

زیراہتمام: سنگت اکیڈمی آف سائنسز

ملنے کا پتہ:

سنگت بک شاپ

عظیم میڈیکل سینٹر

بالمقابل مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ

فون: 0092-81-2843358

انتساب

جاگیرداری کے خلاف لڑی جانے والی جھوک جنگ کو چھپانے،

یا اُسے کوئی اور رنگ دینے والوں

کی راہ روکنے والوں کے نام

جیکو کھیڑے سو کھائے

"ھواں که کیڑی بواڑت دِه ھواں"

فہرست

2014 کے ایڈیشن کا پیش لفظ	8
2011 کے ایڈیشن کا پیش لفظ	15
من رواں پیرءَ سالا ما	18
عشق کے گنوخ لاعلاج !	26
سگِ دنیا......ردِ انقلابی ہوتا ہے	37
انقلاب دشمن، مکارترین انسان	47
زندگی امتحان لیتی ہے	52
دریا، سمندر میں جا گرتا ہے	61
چہ بجا شد...........	67
چُوش نہ بیت (ایسا کبھی نہ ہوگا، عطا شاؔد)	74

2014 کے ایڈیشن کا پیش لفظ

بے علمی کے مزے بڑے ہیں اور علم کے جنجال بہت۔ جنجالوں بھرے روشن فکر خیالات کے نور نے پچھلی صدی کی آخری چوتھائی میں مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تب جس دنیا سے میں روشناس ہوا وہاں وہی بڑے بڑے انقلابات کا تذکرہ تھا جو یورپی لوگوں کے لیے اہم تھے اور جو یورپی انقلابی سکالرز نے لکھے تھے۔ مشرقی بلوغت نابالغ بلاغت کے ہاتھوں ہمیشہ پس ماندہ رہی۔ بڑھاپے میں جا کر معلوم ہوا کہ اکتوبر انقلاب حتیٰ کہ انقلاب فرانس سے بھی بہت پہلے میری آئیڈیل دنیا کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔ یہیں ایشیا میں۔

صرف اپنے من پسند ٹکڑے کو برقرار رکھ کر بقیہ کو پھینک دینا تاریخ کے ساتھ بدترین دھاندلی ہوتی ہے۔ اور یہ اقربا پروری، یہ پک اینڈ چوز ہی تاریخ میں آج تک کا رواج رہا ہے۔ اور اسی رواج کے خلاف (ایک لحاظ سے ہر رواج کے خلاف) لڑتے رہنا ہی سماج کو آگے لے جانا ہوتا ہے۔ متعینات اور مسلّمات کی زلفوں کا اسیر رہنا بدترین سڑاند کی طرف لے جاتا ہے۔

میرے اپنے وطن بلوچستان میں ایک کسان تحریک ''جالاریں کرخا'' 1574 میں چلی
تھی۔ اتنی بڑی کہ یہ تحریک سندھ تک پھیل گئی۔ سومار خان اس تحریک کا لیڈر تھا۔ ہم سائنس میں بھی
تحقیق کی بجائے تقلید کے مریض ہیں۔ اسی طرح میں نے دیکھا کہ میرے سفر کے سنگ ہائے میل
میں شاہ عنایت شہید کا خون بھی شامل تھا۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ ہماری متبرک اولین ملاقات سید سبطِ
حسن کے دو چار صفحوں نے کروائی تھی۔ تب سے لے کر آج تک حیات بخش فکر کے راستے پر چلتے
ہوئے ایک نصف صدی کے دورانیے میں کتنے لوگوں کا احسان مند رہا ہوں، نہ تو شمار ممکن ہے نہ ادائیگی
آسان۔

نظریات کی جنگ میں روشن فکری کو محض ایک محاذ درپیش نہیں ہے۔ کثیر جہتی دشمن کے بے
شمار مورچوں سے نمٹنے کے علاوہ خود اپنی صفوں سے بھی ہمہ وقت برسرِ پیکار رہنا ہوتا ہے۔ شاہ عنایت
کے سلسلے میں داخلی موضوعی لڑائی ہی یہی ہے کہ یہاں بے عملی اور کاہلی کے علمبردار، شاہ عنایت کی فکر کو
سینگوں سے پکڑ کر صوفی گیری اور عدم مزاحمت کی طرف ہی موڑتے رہے۔ اور آج اکیسویں صدی کی
دوسری دہائی تک بھی فیوڈل دانشور اسے کھینچ کھینچ کر بت خانے میں سجانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ترک
ِ دنیا، اور خاموشی کے پہلو نے تو جبر و استحصال پہ مبنی عہدِ ملوکیت اور جاگیردارانہ سماج کو بچائے
رکھا ہے۔ یاروں نے جھوک کمانڈر کو عرسوں کے سیلاب کے حوالے کر رکھا ہے۔ انہوں نے مسلح
جدوجہد کرنے والے لطیف انقلابی کو اگربتیوں کی کثافت میں غرق کر رکھا ہے۔ جھنڈوں جھنڈیوں اور
چرسیوں بھنگیوں کے دھمال میں زندگی کو گھسیڑ دیا گیا ہے۔

عنایت شہید کوئی بے عمل اور تارک الدنیا شخص نہ تھا۔ وہ تو ایک یوٹوپیائی کمیونسٹ تھا جس
نے باقاعدہ ایک کمیون قائم کر دیا تھا۔ اور مساوات پہ مبنی اُس کمیون کی حفاظت کرتے ہوئے جان دی
تھی۔ اُس کی اصل جگہ تو مصنفانہ نظام کی جدوجہد کرنے والوں کے دل اور دماغ ہیں۔ اسے مادام
تساؤ کے انبار خانے کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں ہرایرے غیرے کو ہیرو، اور ہر پرندے کو ہنس بنا
کر پیش کیا جاتا ہے۔

ہمیں ہماری تاریخ سے اکھاڑ پھینکا گیا ہے۔ ہم جو ایک درخشاں تاریخ کے مالک ہیں۔
ہمارا خطہ اپنی زرخیز زمین، بھرپور چاروں موسموں اور محنتی انسانوں کی وجہ سے ہر دم حرکت اور ہلچل کا
مرکز رہا ہے۔ مغرب کے قلم کار و محققین نے گذشتہ تین چار صدیوں سے بہت فعال طور پر اپنے ہاں کی
انسانی سرگرمیوں کو قلمبند و فلمبندو انٹرنیٹ بند کیا ہے۔ اس کی مثال انگلستان میں
جیرالڈ ونسٹن (1609 تا 1652) کی قیادت میں کسانوں کا وہ گروہ تھا جو ''Levellers'' کے
نام سے مشہور ہوا تھا۔ اسے بھی سرکاری فوجوں کے ذریعے کچل دیا گیا تھا۔ وہ ہمارے جھوک کمیون کی
کئی گنا بڑی اور کئی گنا طویل تحریک سے چھوٹا ہونے کے باوجود دنیا بھر میں مشہور ہے جبکہ جھوک کسان
تحریک ابھی تک عالمی تو کیا، ہماری اپنی آنکھ سے پوشیدہ ہے، یا پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

ہمارے اِس پورے منطقے میں بے شمار مزاحمتیں ہوئی ہیں مگر شاہ عنایت تو بالکل ایک نئی
روایت قائم کرتا ہے.......... وطن دوستی، خدمتِ خلق اور ظلم سے ٹکرانے کی نئی روایت۔ وہ ہماری
تاریخ میں پہلی دفعہ واضح طور پر ''انسان'' کو اپنی توجہ اور جدوجہد کا مرکز بنا لیتا ہے اور اسی کی بہبود اور
سربلندی کے لیے کام کرتا ہے۔ شاہ عنایت نے خلقِ خدا پر مسلط ظلم و جبر سے چشم پوشی کو گناہ جانا۔ ابھی
تک تو بزرگوں، ولیوں کی اکثریت میں رواج یہ تھا کہ وہ خلقِ خدا پر ریاستی جبر و استبداد خود بھی خاموشی
سے دیکھتے رہتے اور دوسروں کو بھی خاموش رہنے کا درس دیتے رہتے تھے۔ مگر شاہ عنایت نے یہ سارا
کچھ الٹ دیا۔ اس نے اپنے لہو کی صورت انسانی مساوات اور وطن دوستی کا نیا ذائقہ اولیائی اور ولایت
میں انڈیل دیا۔

اور، یہی وجہ ہے کہ ہم ''جھوک جنگ'' کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس نام پہ ماتھے پہ
بے خبری کی شکنیں نمودار ہونے والے قارئین کو بتانا ضروری ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر
میں آج کے سندھ کے جھوک نامی علاقے میں ایک بہت بڑا انقلابی نمودار ہوا۔ شاہ عنایت اس کا نام
تھا۔ اس نے ایک کمیون (یا مشترکہ کھیتی باڑی کا نظام) قائم کیا۔ یہ لوگ زمین پہ مشترکہ محنت کرتے
تھے اور اجتماعی پیداوار سے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق خرچ کرتے۔ بقیہ ساری آمدن اس کمیون

کی تھی جو لوگوں کے بہبود، بیماروں، اور معذوروں کی کفالت کا ذمہ دار تھا۔ کمیون کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور آس پاس کے جاگیرداروں اور پیروں کے درباروں سے کسان بھاگ بھاگ اس مشترک زندگی میں شامل ہوتے گئے۔ جاگیریں ڈھے جانے لگیں تو جاگیرداروں نے دہلی سے مغل افواج کی مدد سے اس کمیون پر حملہ کر دیا۔ اس جھوک جنگ میں کسان چار ماہ تک اس زمانے کی سپر پاور کے خلاف لڑتے رہے۔ چوبیس ہزار کسان اس جنگ کی بھٹی کی نذر ہو گئے مگر لڑائی جاری رکھی۔ کسانوں کی یہ جنگ دو بڑے نعروں پر مشتمل تھی۔ الارض اللہ (زمین اللہ کی ہے) اور جیکو کھیڑے سو کھائے، یعنی جو کاشت کرے وہی کھائے۔

یلغار گر افواج تھک گئیں۔ معاشی اور دفاعی دباؤ کے پیش نظر وہ یہ لڑائی مزید جاری رکھنے کے اہل نہ تھے۔ دھوکے کا ہتھیار استعمال ہوا۔ وہ قرآن اٹھا کر کسانوں کے پاس آئے، اور اس قران کی ضمانت میں مذاکرات کی دعوت دی گئی۔ مذاکرات کے لیے جانے والے شاہ عنایت کو گرفتار کر لیا، اسے قتل کر دیا اور پھر، بے راہنما کسانوں کی بستی پہ آگ و بارود کی بارش کی گئی۔

شاہ عنایت شہید کی کسان تحریک ایک بالکل ہی انوکھی اور نئی تحریک تھی۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا بھر میں کسانوں کی سب سے بڑی اور سب سے طویل چلنے والی مسلح جنگ تھی۔ مگر بدقسمتی سے ہم اور ہماری نسل کے لوگ اِس سے بالکل بے خبر ہیں۔ میں جب شاہ عنایت شہید رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ پہ حاضری دے آیا اور واپسی پر اپنے احباب کو بلوچی ''حال حوال'' میں بتایا کہ میں حضرت شاہ عنایت کی زیارت گاہ گیا تو چہرے سوالیہ نشان بن گئے اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ اس لیے کہ انہیں شاہ عبدالطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ اور قلندر بادشاہ کا تو معلوم ہے مگر اِس بڑے ولی اللہ اور درویش کے بارے میں انہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

اس سے قبل بھی، یعنی واضح نظریات کی تشکیل سے بہت پہلے بھی، سندھ اور بلوچستان میں کسان تحریکیں اور مسلح لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ گو کہ وہ شاہ عنایت کی تحریک کی سطح کی پذیرائی اور ابلاغ نہ پا سکیں۔ اور نہ ہی قربانی اور جدوجہد میں اُس سطح تک پہنچ سکیں۔ شاہ عنایت کی جدوجہد

تو ہمارے خطے کا ایک خونچکاں باب ہے۔ اسے ہماری نظروں سے اوجھل نہیں رہنا چاہیے تھا۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شاہ عنایت پر جتنے لوگ بھی لکھ رہے ہیں وہ سب کے سب اس کی تعلیمات جدوجہد، نتائج، اور اثرات کی بجائے محض نقالی کرتے جاتے ہیں۔ یورپ میں ہوتے تو دوسروں کی کتابوں، مضامین اور تحقیق کو من وعن، اور بغیر حوالہ دیے ہوئے اپنا بنا کر شائع کرنے کی سزا ٹھوک دی جاتی۔ مگر یہاں ڈھیٹ آدمی ہی کی جیت ہے، وہ خواہ دانشور ہو یا سیاست دان۔

شاہ عنایت پر کام کرنے والوں کی دوسری جعل سازی یہ ہے کہ وہ ضخامت بڑھانے کے لیے پورے سندھ کی تاریخ بیان کرتے ہیں یا پھر مغل حکمرانوں کے اصلی جعلی بیٹوں، بیٹیوں کے تذکروں سے صفحے کے صفحے بھرتے جاتے ہیں۔ پوری کتاب میں اصل مضمون کے محض چند صفحات ۔ بیزاری کی حد تک اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنے والے بسیار نویس دانش خور!۔

جھوک شریف گذشتہ چالیس برس سے میری نگاہوں کا مرکز رہا ہے۔ میں وہاں کے لعل، شہید شاہ عنایت کے مقبرے کی زیارت کے لیے ہمیشہ بے تاب رہا۔ آیئے اپنے اِس آئیڈیل کی تفصیل دیکھتے ہیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ ہم کتنے بڑے انسان اور کتنی بڑی تحریک کے ذکر کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

مجھے یہ بتانے دیں کہ شاہ پر تحقیق میں عجیب عجیب دشواریاں ہیں۔ سارا سورس اور کلام فارسی میں ہے۔ اور شاعری میں ہے، اور قلمی نسخوں والا ہے۔ رزمیہ شاعری ہر جگہ اور ہر زبان میں مائتھالوجی سے بھری ہوتی ہے۔ نیز غیر ضروری اور حاشیہ نگاری کو تیر کر گزرنے اور اپنے تاریخی مطلب کی سیپی نکالنے میں جو مشکل پیش آتی ہے، وہ میں نے بھی بھگتی۔ (گو کہ صوفی دلپت کے بقول جو مائتھا لوجی کے اِن رازوں پر شک کرے گا، اس کا اندر کالا ہو گا)۔

میرے اس کتابچہ کا پہلا ایڈیشن 2011 میں شائع ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کتاب خاموشی کے اتاہ سمندر میں ہلچل مچا دے گی اور شاہ عنایت پر تحقیق و تالیف کے ایک بڑے سلسلے کو جنم دے گی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ ہوا بھی تو نقالی اور تیسرے درجے کی کام چوری سے ہوا۔ یار

لوگ (بالخصوص سندھ میں) بغیر حوالے دیے ہوئے دوسروں کے صفحے کے صفحے چوری کرتے ہیں، یا پھر تصویروں اور موضوع سے بہت دور غیر ضروری مواد سے کاغذوں کا پیٹ بھر کر اپنی تصنیف کو ضخیم بنانے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ لے دے کر میرے پچھلے کتابچے سے اثر لے کر جناب صلاح الدین شہبازی نے **سنگت** میں ایک خوبصورت تاثراتی مضمون لکھ دیا۔ ننگر چنا نے ایک سندھی افسانے کا ترجمہ کر دیا۔ لاڑکانے کے خالد چانڈیو نے پرانی کتابیں اور دستاویزات بھجوا دیں، جو مجھ سے نہ پڑھی جا سکیں۔

چنانچہ میرے کتابچے کا پہلا ایڈیشن وہ کچھ نہ کر سکا جس کی میں توقع رکھتا تھا (ایک تو میں توقعات بہت رکھتا ہوں)۔ مگر اپنی بے ریش ٹھوڑی پہ ہاتھ پھیر کر قول کیا کہ شاہ عنایت کے بارے میں خاموشی کو توڑ کر رہوں گا۔ اتنی بڑی جدوجہد اور سرفروشی کی اتنی بڑی داستان کو فراموشی کے صحرا میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔

سندھ بلوچستان میں بہت سے دانشور ''یہاں طبقات موجود نہیں ہیں'' کا ورد کرتے کرتے، اور اس بہانے اپنے اوپری طبقات کی خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہو چکے ہیں۔ انہوں نے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی اس سب سے بڑی طبقاتی جنگ کا تذکرہ نہیں کرنا تھا۔ مگر جن لوگوں نے طبقاتی سیاست میں عمریں بتا دیں انہیں بھی اس بڑی کسان جنگ سے تقویت حاصل کرنے کا نہ سوجھا، اسے اون کرنے، اسے اپنے کاز کے لیے Source of Inspiration بنانے کا نہ سوجھا۔ اتنی مضبوط و گہری بنیادیں ہونے کے باوجود ایک تحریک بے بنیاد رہی، حیرت ہے۔ اصلی بنیادیں ہونے کے باوجود یہ کبھی چینی کسان انقلاب کی نقالی کرتے رہے کبھی کوریا، نکسلائٹز اور کابل کی۔ یوں خارجی، اجنبی اور مصنوعی بنیادیں تلاش کرتے رہنے سے ہماری تحریک خود ہی اپنی ناکامی کی قبر کھودتی رہی۔

میں نے سنا ہے کہ یوسف سندھی نے شاہ عنایت پر لکھے گئے میرے سابقہ ایڈیشن کا سندھی ترجمہ کر کے اُسے شائع کیا ہے۔ یقیناً اُسے اس کا ثواب ملے گا۔ (اجر اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ اجرت اور اجر میں موجود ''ت'' کا فرق ایک انقلابی کو این جی او والا بنا ڈالے گا)۔

اس نئے ایڈیشن میں مجھے شاہ پہ خصوصی کتابچہ جدا کرنے کا خیال ہی اس لیے آیا کہ ایک تو اس پہ میرا کام اور معلومات زیادہ ہوئیں۔ دوسرا اس لیے کہ خواہ پچاس صفحے بنیں یا ساٹھ، اس ہیرو کو ممتاز و نمایاں کرنا سخت ضروری ہے کہ یہ تحریک صفحوں کی وجہ سے اہم نہیں، اہمیت کی وجہ سے کئی صفحوں کی حامل ہے۔

باپ ہوتے ہوئے ایک تحریک کو یتیم اور بن باپ کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ تحریکیں جانداروں کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد ہوتے ہیں، رسم و رواج ہوتے ہیں، کامیابیوں ناکامیوں کی تاریخ ہوتی ہے۔ اپنی سرزمین سے اخذ کردہ نعرے اور شعار ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں پیچھے مڑا، اپنی جڑیں دریافت کیں اور ان دریافتوں کو اُن کے اصل وارث یعنی محنت کش تحریک کے حوالے کر دیا۔

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری، 2014

2011 کے ایڈیشن کا پیش لفظ

شر، بدی اور ابلیسیت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ایک پورا قبیلہ ہے جس کا شجرۂ نسب بہت طویل ہے۔ یہ نہ صرف اپنے آباؤ اجداد سے پہچانی جاتی ہے، بلکہ اسی کے تذکرے اور تجربات سے تقویت پاتی ہے۔

بعین ہی خیر کا معاملہ ہے۔ نیکی اور خیر بغیر جڑوں کے کبھی نہیں رہے۔ خیر کے شجر کا اپنا شجرہ ہے۔ خیر کا پرچم، نعرہ اور بینر ''انسانوں سے بھلائی'' کا رہا ہے۔ خیر کو مگر دشواریاں بہت کٹھن درپیش ہیں۔ اس کا ویری اگر سماجی معاملات پہ شیطان رہا ہے تو یہ سیاسی معاملات میں سامراج رہا ہے۔ اسے صحت کے شعبے میں چیچک وطاعون وایڈز کے خلاف جدوجہد کرنا پڑتی ہے، سماجی میدان میں بے علمی اور بے اتفاقی کے خلاف لڑائی لڑنا پڑتی ہے، اسے راست وراستبازی کے حق میں حرکت وتحریک رواں رکھنی ہوتی ہے اور کائنات میں موجود دیگر مخلوقات کے ساتھ بقائے باہم میں زندگی گزارنے کی شعوری کوشش کرنی ہوتی ہے، اور فطرت دوستی سے مسرت کشید کرنا ہوتی ہے............ یہ کس قدر وسیع ایجنڈا

ہے............ خیر کبھی محدود مینی فیسٹو لے کر نہیں چلتی۔ یہ صرف ایک طبقے، ایک قوم، ایک مخلوق کی ترجمانی نہیں کرتی............ خیر نے تاریخ کے طویل دورانیے میں اچھی اچھی چیزوں کو چُنتے رہنے اور اپنی زادِراہ کے بطور اپنی گدڑی میں ڈالتے رہنے کا کام کیا ہے۔

خیر انسان دوستی کا دوسرا نام ہے۔ مگر وہ بھلا کیسا عاشق ہوگا جسے محبوبہ سے تو عشق ہو مگر پھولوں پھلواریوں آبشاروں، مسکراہٹوں، امن اور خوشحالیوں سے پیار نہ ہو۔

لہٰذا اگر شیطان کا تباہی وتخریب کا ایجنڈا بہت وسیع ومتنوع ہے تو خیر کا منشور بھی بہت پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ہر بات کا غم، ہر چیز پہ پریشانی اور ہر کام کا عزم۔

ایک منصفانہ اور خوشحال سماج کے لیے انسان ہمیشہ سے کوششیں کرتا رہا ہے۔ کبھی ایسے طریقوں سے کہ آج ہنسی آجائے اور کبھی ایسے طریقوں سے جنہیں رواج وروایت بنا کر بار بار آزمایا گیا ہے۔ سماجی انصاف کے لیے یہ ساری انسانی کاوشیں ڈریس ریہرسلیں رہی ہیں۔ حتمی منزل اُتنی ہی دور ہے جتنا کہ اولین لڑاکا کے وقت تھی۔ مگر چھوٹی چھوٹی اتنی بڑی تبدیلیاں آئیں کہ تاریخی اہمیت کے اعتبار سے بہت ہی اہم حاصلات ہوئیں۔

خیر بھی انسانی سماج کی طرح اور اس کے ساتھ ساتھ ارتقا کرتی رہی ہے۔ یہ مدھم وموہوم سے روشن وواضح کی طرح سفر کرتی رہی ہے۔ شروع کے خیر خواہ انسان وہ تھے جنہیں یوٹوپیائی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ سماج میں بغیر کسی بنیادی تبدیلی کے محض اصلاحات کے ذریعے بہتری لائی جاسکتی ہے۔ انہوں نے بے شمار طریقے ایجاد کیے اور انہیں استعمال کیا تا کہ مجبور ومقہور ولاچار انسانوں کے لیے اچھی روشن صبح پیدا ہو۔ یہ کتاب انہی نیک دل مگر سادہ انسانوں کے تذکرے کا بہی کھاتا ہے۔

جدوجہد اچھی چیز ہے۔ غلطیاں اچھی چیزیں ہیں۔ بس جدوجہد ترک نہیں کرنی چاہیے اور غلطیاں دوہرانی نہیں چاہئیں۔ انسان آخر انسان ہے، کبھی دیکھو تو خود رو عوام الناس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے کبھی دیکھو تو ''بڑا لیڈر'' والی بیماری میں مبتلا ہو کر تباہیاں بکھیرتا رہتا ہے۔

یہ سب ورثہ ہمارا ہے، یہ ساری تاریخ ہماری ہے۔اس سب کو بانہوں میں سمو کر مستقبل کا راستہ بنانا ہے۔اس سارے انسانی تجربے کو پھینکا نہیں جا سکتا...... کہ انسان کی جڑیں ہیں۔ بے جڑ ہونا غیر انسانی ہے۔اپنی جڑیں تلاش نہ کرنا غیر انسانی ہے۔

آیئے اے اچھے انسان! اپنی جڑیں تلاش کریں۔

شاہ محمد مری

ماوند

6جولائی 2011

من رواں پیرءَ سلاما

ہم،سندھ کے شہر ٹھٹھہ سے 35 میل دُور ایک بستی کی بات کر رہے ہیں؛ میراں پور۔ اسے جونپور کے میران مہدی سید محمد کی نسبت سے میراں پور کہا جاتا تھا۔ اِس پُر رونق اور سرسبز بستی میں ایک انقلابی نے جنم لیا اور بستی کے صدیوں پرانے اِس نام میراں پور کو ''جھوک'' (بسیرا) کا نام دے گیا۔ تب سے آپ کو جھوک ہی کا نام ملے گا، میراں پور کا نام تو صرف تاریخی کتابوں میں رہ گیا ہے۔ اِس جھوک (اور میراں پور) کو اِس ایک انسان کی آمد اور جاگیرداروں کے خلاف اُس کی معرکتہ الآرا طویل گوریلا جنگ سے اِس قدر تقدیس نصیب ہوئی کہ شاہ لطیف بھی یہاں کی زیارت کرنے آیا تھا۔ دَلپت صوفی، بیدل فقیر، صدیق فقیر سب اِس ''شہیدوں کے سرتاج'' اور ''عاشقوں کے سردار'' کے درِ اقدس میں آ کر سرِ نیاز جھکاتے رہے ہیں۔ کچھ نے تو بیعت بھی یہاں سے کی۔

شاہ عنایت شہید رحمتہ اللہ علیہ پیدا بھی یہیں جھوک میں ہوا تھا۔ 1655 اُس کی پیدائش کا سال ہے۔ اس کے والد کا نام مخدوم فضل اللہ تھا۔ شاہ شہید کے آباؤاجداد کا نسب نامہ یوں بتایا جاتا ہے؛

''شاہ عنایت ولد مخدوم فضل اللہ بن شہاب الدین بن ملاّ یوسف بن ملاّ آجب بن مخدوم

خداآ گاہ بن حضرت صداللہ عرف صدو لانگاہ'' (1)۔محققوں کے لیے لانگاہ اور بلوچوں کا قبیلہ ''لانگہ، یا لانگو'' ہمیشہ سے زیرِ بحث معاملہ رہا ہے۔ یہ ایک ہی لوگ ہیں یا الگ الگ، مختلف تھیوریاں کتابوں میں موجود ہیں۔جن لوگوں کا خیال ہے کہ لانگاہ بلوچوں کا ''لانگو'' قبیلہ ہی ہے، تو اس قبیلہ کے بارے میں تو بے شمار معلومات موجود ہیں۔ لانگووَں نے تاریخی طور پر سونمیانی بندرگاہ کے عروج کے زمانے میں سارے ہند تک اپنے شتر کاروانوں کے ذریعے تجارت کی ندیاں رواں رکھی تھیں۔اس کے علاوہ اس نے بہت عرصے تک سبی سے ملتان تک کی سلطنت پہ حکمرانی کی تھی۔اس قبیلے میں بے شمار عالم، ادیب اور ولی اللہ گزرے ہیں۔یہ قبیلہ ارغونوں، ترخانوں اور مغلوں سے کئی بار ٹکرایا۔

شاہ عنایت شہید کا جدِ امجد حضرت صدو لانگاہ (یا لانگو) اُچ شریف کی غوثیہ درگاہ کا اِس قدر معتقد تھا کہ ہوتے ہوتے یہ خاندان ملتان سے سندھ منتقل ہوگیا۔اور میران پور کے شہر میں آن بسا تھا۔

شاہ شہید کی ابتدائی تعلیم اُس کے درویش منش، اور جید عالم، والد نے ہی کی۔ یہ زمانہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے چل چلاؤ کا تھا۔گوکہ اورنگ زیب نے تعلیمی نصاب سمیت ہر شعبہ زندگی کو بنیاد پرستی کی گہری قعر میں ڈال دیا تھا لیکن کچھ شعبے ابھی تک اُس کی ضیاالحقی دست برد سے باہر تھے۔

والد نے بیٹے کو بہت جامع تعلیم دی۔ناظرہ قرآن کے بعد اُسے سعدی، حافظ اور رومی کا گویا حفظ کرادیا۔اِن مفکروں اور عالموں کی کتابوں میں تو زندگی اور زندگی سے متعلق ساری باتیں سموئی ہوئی ہیں۔یہی تو بنیادیں ہیں جن سے بچوں کو آشنا کرانا آج بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا شاہ شہید کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ بعد میں جب شاہ عنایت بڑا ہوا اور ایک انقلابی تحریک کا سپارٹیکس بنا تو وہاں آپ کو اُس کی زندگی اور تحریک کے ایک ایک نشیب اور ایک ایک فراز میں حافظ و رومی و سعدی نظر آئیں گے۔اُس کا ادبی ذائقہ پڑھیں گے تو آپ کو لطف آئے گا۔اور ادب پر اُسے کتنا عبور تھا، دیکھ کر آپ حیران ہوں گے۔

مخدوم فضل اللہ نے صرف بیٹے کو ہی نہیں پڑھایا، بلکہ وہ تو دور دراز سے آئے ہوئے بزرگ و کمسن شاگردوں کی ایک ڈار ساتھ لیے رہتا تھا۔اُس دور میں درس و تدریس پیری فقیری کا ایک لازمی عنصر ہوا کرتا تھا۔اس ابتدائی، اور تقریباً تقریباً اعلیٰ تعلیم کے بعد شاہ عنایت حصولِ علم کے لیے ''گردوگرما وگدا وگورستان'' کے شہر ملتان چلا گیا۔اور وقت کے بڑے عالم شیخ شمس الدین ملتانی کا شاگرد بنا۔

اُس زمانے کے استاد محض پہاڑے اور صرف ونحو نہیں پڑھاتے تھے۔اور نہ ہی فضول و فرسودہ مواد نصاب میں ڈالتے تھے۔اُس وقت سکول کا متبادل نظام موجود نہ تھا، بس یہی ایک نصاب موجود تھا۔اس کے اندر زندگی کے سارے رنگ، سارے مسائل اور اُن کے حل پر مشتمل باتیں شامل ہوا کرتی تھیں۔استاد شاگرد کی شخصیت بناڈالتے تھے اور اس کی سماجی زندگی کا رخ متعین کرتے تھے۔ وہ عمر بھر اس کا گائیڈ بنے رہتے تھے۔چنانچہ شمس نے اپنا سارا علم عنایت اللہ کے ذہن میں انڈیل دیا اور پھر اسے اگلے سٹیشن دھکیل دیا؛ ہندوستان!

شاہ عنایت ہندوستان کی سیاحت، اور مختلف بزرگوں سے ملاقاتوں کا شرف حاصل کرتے ہوئے حیدرآباد دکن میں بیجاپور کے مقام پر جا کرٹک گیا(2)۔وہاں اس کا استاد ایک خدارسیدہ بزرگ شاہ عبدالملک بنا۔حیرت ہے کہ اس بڑے عالم، معلم اور مجتہد کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ مجھے یقین ہے کہ جب دانشور و محقق شاہ عنایت اور اُن کی تحریک کے بارے میں جان جائیں گے تو ضرور شاہ عبدالملک کے بارے میں کھوج اور تحقیق شروع کریں گے۔

شاہ وہاں کئی سال ٹھہرا۔شاہ عبدالملک صاحبِ علم وبصیرت ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں حکمرانوں کے بھی بہت قریب تھا۔اِس طرح وہ شاہ عنایت کی نہ صرف دینی اور روحانی پرورش کرتا رہا بلکہ اسے دنیاوی امور میں بھی اچھی خاصی شُد بُد عطا کردی۔وہ جسے ہم سیاسی شعور کہتے ہیں، وہ شاہ عنایت کو وہیں اُس استاد نے ودیعت کیا۔شاہ عنایت کو ریاست، ریاستی امور، اور عوام الناس کی حالت کے بارے میں سیکھنے کا خوب موقع ملا۔یہیں سرکاری قربت میں اسے اندازہ ہوا کہ نابرابری

والا طبقاتی سماج کس قدر بے انصاف ہوتا ہے۔ اور یہیں اس نے اس ناانصافی، ظلم، جبر اور استحصال کے تدارک کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

ہمارے ممدوح نے عبدالملک شاہ کے سائے تلے علم و تفکر کی منزلیں طے کیں۔ وہاں موجود علم کی سیڑھیاں چڑھیں اور اگلے پڑاؤ کے لیے مزید آگے روانہ کر دیے گئے۔ مگر وہاں سے رخصت ہوتے وقت ایک خاص واقعہ رونما ہوا تھا جس کا ذکر بہت ضروری ہے۔ ہوا یوں کہ شاہ عبدالملک نے سند، اور سرٹیفکیٹ کے بطور اسے چوغہ و خلعت عطا کر دیے۔ مگر، شاہ عنایت نے استاد کی جوہر دار تلوار بھی مانگ لی۔ استاد نے بخوشی وہ اسے دے دی مگر ساتھ میں یہ سوال ضرور کیا کہ ''فقیر! اس تحفے کو کس قیمت پر دو گے؟''۔ شاہ عنایت نے گردن جھکائی اور کہا ''سائیں، اس کی قیمت گردن ہے''۔ اور کسی کو کیا خبر تھی کہ اسے اس تلوار کی واقعتاً اتنی بڑی قیمت چکانی پڑے گی۔ عالم لوگوں کا ہر فقرہ پُر معانی ہوتا ہے!! وضاحت آگے چل کر کروں گا۔

جیسا کہ ذکر ہوا، سید عبدالملک شاہ نے جب شاگرد کے اندر علم و جستجو کی حد کو اس قابل پایا تو اسے کچھ اور شعبوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے شاہ جہان آباد میں مقیم، وقت کے مشہور عالم اور استاد، شاہ غلام محمد کے پاس بھیج دیا۔ شاہ شہید اُس کے ساتھ ایک سال رہ کر اپنا علم اوجِ کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ اور عالم کا اوجِ کمال کیا ہوتا ہے: عاجزی، یاس و حزن اور دکھ درد کے معانی جاننا، غریبوں زیر دستوں کی سرد آہوں کا مطلب جاننا، اور ان کے چہروں کی زردی اور آنکھوں کی بے نوری کی وجوہات جاننا۔

یہاں شاہ عنایت نے فلسفہ اور نظریہ کی اپنی دنیا کی تشکیل مکمل کی۔ اس نے اپنا فلسفۂ حیات وہاں اپنے اِس استادِ محترم کے سامنے بیان کر دیا۔ یہ اس قدر واضح اور قابلِ عمل انقلابی نظریہ تھا کہ اُس کا استاد شاہ غلام محمد خود اپنے شاگرد کا معتقد بن گیا۔ پیر، مُرشد میں ڈھل گیا اور شاگرد، استاد بن گیا۔ غلام محمد اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے اِس جوانسال مرشد کے ساتھ ہو لیا۔ ایک ایسا کامریڈ جو کرامت سے نہیں بلکہ فلسفہ سے متاثر ہو کر شاہ شہید کے ساتھ جدوجہد کے سفر پہ نکلا۔ شاہ عنایت، شاہ غلام محمد

اور اپنے سیکڑوں دوسرے کامریڈوں اور فکری مریدوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہوتا ہوا سندھ میں داخل ہو گیا۔

واضح رہے کہ شاہ عنایت تقریباً دس (اور کچھ محققین کے خیال میں بارہ) برس باہر رہ کر سندھ واپس لوٹا۔ اس دوران وہ بلوچستان آیا تھا۔ یہاں سے پھر وہ افغانستان و ایران گیا اور پھر عراق کا مطالعاتی سفر کیا۔ ظاہر ہے کہ شاہ عنایت جیسے تعلیم یافتہ اور باشعور مطالعاتی و مشاہداتی ذہن نے مزدک و مانی کی مساوات کی تحریکوں کو اپنے افق کو چھو لینے دیا ہوگا۔ ہندو سندھ تو وہ پہلے ہی اچھی طرح دیکھ اور پڑھ چکا تھا۔ یوں بدھ مت سے لے کر جین فلسفہ اور وحدت الوجود سے لے کر ایرانی سطح مرتفع کے سارے علوم پہ اسے بھرپور دسترس حاصل ہو گئی۔ اب وہ رابعہ خضداری سے لے کر مہناز رند تک ہر بغاوت سے آگاہ و آشنا ہو چکا تھا۔ اِن سارے علوم نے اُس کے نئے فلسفے میں گندھ جانا تھا۔ مولانا روم کا عشق (کمٹ منٹ) تو خیر سارے مشرقی فلسفوں کی ریل گاڑی کا انجن بنا رہا۔

اسی زمانے میں سندھ کے اندر میاں دین محمد کلہوڑا ایک بڑی طاقت کے بطور ابھرا تھا۔ اور وہ بھکّر سے لے کر سبی تک کے مغل گورنروں کے لیے خطرہ بنا رہا۔ لڑائیوں کے لمبے سلسلے کے بعد میاں دین محمد کلہوڑا گرفتار ہو کر سال 1700 میں ملتان میں مغلوں کے ہاتھوں شہید کر دیا گیا۔ اُس کا بھائی میاں یار محمد قلات بھاگ آیا اور بلوچوں کے ہاں پناہ گزین ہو گیا۔ دو سال جلاوطنی کاٹ کر جب وہ سندھ لوٹا تو اورنگ زیب کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اس نے قلات کے بلوچوں اور تالپر بلوچوں کی مدد سے پڑوسی قوتوں سے اپنے مقبوضہ علاقے دوبارہ حاصل کر لیے۔

زوال پذیر اورنگ زیب کی ماتحتی میں میاں یار محمد کلہوڑا سندھ پہ بادشاہی کرنے لگا۔ اس کو مغلوں نے ''خدا یار خان'' کا لقب دے رکھا تھا۔ (یہ حاکم بھی عجب لوگ ہوتے ہیں۔ ایک بھائی کو قتل کرتے ہیں اور دوسرے کو تخت بھی دیتے ہیں اور خدا یاری کا خطاب بھی!!!)۔ چنانچہ اب وہ یار محمد بھی تھا، اور خدا یار خان بھی تھا۔ واضح رہے کہ سندھ کے اندر یہی کلہوڑے روحانیت میں بھی حاکم تھے۔ وہ پیری مریدی کے بطور، قابلِ احترام ہوا کرتے تھے۔ اور جب بادشاہی بھی ملتی ہے تو ہر پیر فقیر

کٹر مولوی بنتا ہے۔ چنانچہ اب ملّا اور مفتی، کلہوڑوں کے دستِ راست بن گئے تھے۔

اسی یار محمد کلہوڑی نے اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر شاہ عنایت سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھے گا اور ساتھ دے گا۔

اورنگ زیب کے عہد میں صوبے آج کی طرح کے نہ تھے۔ بلکہ موجودہ سندھ، بلوچستان کے میدانی زرعی علاقے اور پنجاب مالیہ اور ٹیکسوں کے تقریباً ایک جیسی لاٹھی سے ہانکے جاتے تھے۔ کلہوڑوں کے دور میں پہلی بار نہریں کھود کر دریا کے پانی پر کاشت کی ابتدا کی گئی اور دیہات میں فیوڈل ازم مضبوط بنیادوں پر ترقی کرنے لگا۔

کلہوڑوں کی حکومت مغل فرمانرواؤں کو محصول ادا کرتی تھی۔ کسان اپنی فصل میں سے ایک مقررہ مقدار لگان کے بطور اِن حاکموں کو دیتا تھا۔ کام کاج نہ کرنے والا ویلھڑ اور سڑاندھ بھرا طبقہ امیروں، نوابوں، زمینداروں، اور پیروں کی صورت میں موجود تھا۔ یہ طبقہ صرف اور صرف کسانوں کے استحصال پر زندہ تھا۔ کسان کی اس فصل میں سے جاگیردار کے علاوہ مقاطع دار، ملّا اور سیّد بھی اپنا حصہ لے جاتے تھے۔ (باقی کیا بچتا ہوگا!)۔

اورنگ زیب 1707 میں مرگیا۔ ظاہر ہے اس جابر و آمر کی موت کے بعد اُس کے تخت پر خانہ جنگی شروع ہوئی۔ شہزادہ اعظم، شہزادہ معظم کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ کام بخش مارا گیا، اور شہزادہ معظم چار سال تک تخت پر شاہ عالم اول کے نام سے بیٹھا رہا۔ مرگیا تو اس کے چاروں بیٹوں (جہاں دار شاہ، عظیم الشان، جہاں شاہ اور رفیع الشان) نے تلواروں کو منصف بنایا۔ ایک بھائی نے تین بھائی قتل کر دیے اور بادشاہ بن گیا۔ یہ جہاں دار شاہ تھا۔ مگر ایک سال کے اندر اندر عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے چچا کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا اور خود بادشاہ بنا۔

شاہ عنایت کے سندھ لوٹنے کے وقت فرخ سیر نامی بادشاہ (1712-1719)، نزع کے عالم میں پڑی مغل ریاست کی ہلتی چُولیں پکڑے ''بادشاہت'' کر رہا تھا۔ ہر جگہ بغاوتیں تھیں، جنگیں تھیں، جنگی ٹیکس تھے اور مہنگائی تھی۔ وہ اورنگزیب کی طرح بہت ہی ظالم بادشاہ ثابت ہوا۔ اس

نے بے شمار لوگ قتل کروا دیے۔ قتل تو خیر بادشاہوں حاکموں کی حکموانی کے بہت بڑے اوزار رہے ہیں، اس سفاک شخص نے تو امیر الامرا ذوالفقار خان اور راجہ سبھ چند دیوان کی زبانیں کٹوا دیں۔ خود اپنے چھوٹے بھائی ہمایوں بخت کو اندھا کر کے قید خانے میں ڈال دیا(3)۔ تخت اندھا کر دیتا ہے!!

فرخ سیر کی بادشاہی میں ملک کی ایسی ابتر صورت حال تھی کہ اس زمانے کے مشہور ظریف شاعر جعفر نے ایک ہی شعر میں پورے ماحول کا نقشہ کھینچ دیا تھا:

سکہ زد برگندم و موٹھ و مٹر

بادشاہِ پشہ کُش فرخ سیر

ترجمہ:

گندم، موٹھ اور مٹر پر ٹیکس لگا دیا

مچھر مار بادشاہ فرخ سیر نے

(4)

فرخ سیر کے ظالمانہ کرتوتوں کے بارے میں لوگوں کو بہت کم معلومات ہیں۔ مگر خود اورنگ زیب بھی اس شعبے میں بہت بڑا اقصاب ہو گزرا ہے۔ یہ تو معلوم بات ہے کہ اورنگ زیب ایک بہت ہی بنیاد پرست شخص تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں کی آنکھیں نکلوالیں، انہیں زندانوں میں ڈال دیا، اور یوں اپنی کرسی بچاتے رہنے والا یہ شخص بہت ہی شکی مزاج، ظالم اور سفاک تھا۔ اسی نے تو اپنے فلسفی اور دانشور و شاعر بھائی داراشکوہ کو جلاد سے قتل کروا کر تصدیق کے لیے اُس کا سر دربار میں منگوایا اور خود ملاحظہ فرما کر یقین کر لیا کہ اس کے تخت کو اپنے بھائی سے اب کوئی خطرہ نہ رہا۔ اس نے ریاست اور ریاستی اداروں کو اپنی بنیاد پرستی کی وجہ سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ خود ہماری نسل گذشتہ چالیس برس سے اورنگزیب کی روحانی اولاد ضیاالحق کی نظریاتی اکھاڑ پچھاڑ جھیل رہی ہے۔ اورنگزیب کی لائی بربادی (توضیا کے گیارہ سالوں کی بجائے) پچیس برسوں پر مشتمل تھی۔ ایسی کٹھ ملائیت جس کی اصلیت دیکھ کر داراشکوہ چیخ اٹھا تھا:

بھشــت آنــجــا کــہ ملّائے نــہ بـاشـد
ز ملّا بــحـــث و غــوغـائے نــہ بـاشـد
جھـــاں خـــالـی شــوداز شــورِ مــلا
زفتــوا هـــا ش پـــروائے نـــہ بـــاشـد
دراں شھـــرے کـــہ ملّا خـــانـــہ دارد
درانـــجـــا هیــچ دانـــائے نــہ بـــاشـد
مـــہ بیـں اے قـــادری تــو روئے ملّا
مــرو آنــجـا کــہ شیـدائے نــہ بـا شـد

(5)

عشق کے گنوخ لاعلاج

انارکی میں تو حکومت کی تنزلی ہو جاتی ہے، لوگ بے عمل ہوجاتے ہیں، سست و کاہل ہوجاتے ہیں، عمل اورزندگی کی ساری قوتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ سارے ماحول کا جبڑا ٹیڑھا ہوجاتا ہے۔ رسم رواج، اخلاق عقیدہ روبہ زوال ہوتے ہیں۔ سوکھے، بے مہر اور لاحاصل مباحثے مناظرے عقل و خرد کا منہ چڑاتے رہتے ہیں۔

شاہ عنایت تو سوچ سمجھ رکھنے والا شخص تھا۔ تفکر اُسے بار بار سکھایا گیا۔ اور مفکر و فلسفی راسخیت کا تو بیخ کن ہوتا ہے۔ چنانچہ عنایت نے اس سخت گیری وراسخیت اور کٹھ ملائیت سے ابھرنے والی ہر سماجی اورنفسیاتی کج روی کے خلاف اپنے فلسفے کو صف آرا کر دیا۔

شاہ عنایت نے ٹھٹھہ کے مقام پر قیام کیا۔ یہ اُس کا شہر اِنتخاب اس لیے بنا کہ اُس زمانے میں یہ سندھ کا بہت بڑا شہر تھا۔ اور بڑے شہر عالموں، دانشوروں، ادیبوں، فقیروں اور فلسفیوں کے مرکز ہوتے ہیں۔ اور یہیں ٹھٹھہ میں وقت کے حکمران آباد تھے۔

شاہ شہید اپنے سیکڑوں ساتھیوں سمیت شہر کے قریب موجود میدان میں پڑاوٗ ڈالتا ہے۔

ایک اجتماعی کاشتکاری کا نظام وضع کرتا ہے۔واضح رہے کہ مغل نے اپنے گماشتے عجب طرح سے ترتیب دے رکھے تھے۔ وہ فوجی یا منتظم کو تنخواہ کے عوض جاگیر دیا کرتا تھا۔ یہ جاگیر ہوتی تو بادشاہ کی ملکیت میں تھی، مگر یہ غیر مستقل طور پر اُس وقت تک اپنے خدمت گزار کو دی جاتی تھی جب تک کہ وہ خدمت بجالاتا، یا اس کی وفاداری داغدار نہ ہوتی، اور یا پھر اُس سے بھی بہتر خدمت گزار پیدا ہوتا۔

یہ لوگ ملاؤں، پنڈتوں، پیروں اور دیگر محنت نہ کرنے والوں کو بھی جاگیریں دیا کرتے تھے۔ان جاگیروں پر ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ان جاگیروں کو ''مدد معاش'' کہا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں شاہ عنایت کے بزرگوں کو میراں پور، جھوک میں بٹوری کا علاقہ دیا گیا۔

شاہ عنایت کی اجتماعی کاشتکاری میں جو بھی کاشت میں حصہ لیتا پیداوار میں شریک ہو جاتا۔یہیں پہ کئی لوگ اُس کے فلسفے سے متاثر ہوئے اور اپنی زمین اس کمیون کے حوالے کر دی جس پر اجتماعی کاشت کاری ہونے لگی۔ یوں سب لوگ محنت اور فصل میں برابر کے حصہ دار بنے۔کمیون کے طرز پر بسائی گئی اس آبادی کو ''دائرہ'' کہتے تھے۔انسانی مساوات کی بنیاد پہ رہنے بسنے والی اس آبادی نے واقعتاً کمیون ازم کی بنیادیں ڈال دیں۔(ہم انقلابِ فرانس سے بھی پہلے کی بات کر رہے ہیں)۔اِن سب نے اپنے نئے نظریے کا پرچار شروع کر دیا۔آس پاس کے استحصال شدہ، لُٹے ہوئے محنت کش کشاں کشاں اس اجتماعی اور برابری والے کمیون کی طرف آتے رہے۔اور یہ تحریک بڑھتی گئی۔

بنیاد پرستی ہمیشہ افراتفری کو جنم دیتی ہے اور روشن فکری ہمیشہ اس افراتفری سے جنگ لڑتی ہے؛ دوبدو جنگ۔شاہ اس کثیر الجہتی جنگ کے لیے بہت عرصے سے تیاری کر رہا تھا۔ وہ اس بارے میں اذہان بنا رہا تھا۔عملاً وہ سب کچھ کر کے دکھا رہا تھا جو موجود طبقاتی جابرانہ نظام کا الٹ ہو۔عوام دیکھ رہے تھے، چکھ رہے تھے، سمجھ رہے تھے، جُڑ رہے تھے۔

یہ تو ایک انقلاب تھا۔انقلاب تو جاگرتا ہوتا ہے، بیداری ہوتا ہے۔ وہ دیگر لوگ جو ابھی تک جاگیرداروں کی زمینوں کی غلامی کر رہے تھے ان میں بھی بڑی بڑی بیداری پیدا ہوئی۔اور بیداری

بہت قوی ہوتی ہے۔اس کا دبدبہ بڑا ہوتا ہے۔چنانچہ شاہ عنایت کی پیدا کردہ بیداری نے ہر کسان کی جھونپڑی میں انگڑائی لی اور ہر جاگیردار کے محل کے صدر دروازے ہلا ڈالے۔اب پورے علاقے میں جاگیردار کا حکم خدائی حکم نہ رہا تھا، اب بے زمین کسانوں کی بہو بیٹیوں کی عصمت لوٹی نہ جا سکتی تھی(6)۔انہیں ''دائرہ'' کی زبردست پیداواریت اور وہاں کاشتکاروں کی خوشی دیکھ کر پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ان کی بھوک کی وجہ تو ذاتی ملکیت ہے ....اور اس کا مداوا ''دائرہ'' کی طرح کی اجتماعی کاشتکاری تھا۔

یہ تو ایک ساکت و جامد فضا میں گویا ایک زلزلہ تھا۔اس زلزلے نے روایتی درباری مولویوں، پیروں اور زوال پذیر مغل سلطنت کے مغل امرا اور اُن کے گماشتہ مقامی حکمرانوں کو لرزا ڈالا۔شاہ شہید کے علم، عرفان اور زندگی کے بارے میں اُس کے ایک نئے ارفع و اعلیٰ انسانی اقدار پر مشتمل طرز سے حکمران طبقات کو اپنی دنیا تباہ ہوتی نظر آئی۔شاہ عنایت کی یہ تحریک تو غلام عوام کے اندر خود اعتمادی، عزت نفس اور بیداری پیدا کر رہی تھی۔ یہ تو جاگیرداری سماج کے لیے موت تھی۔چنانچہ نجی ملکیت پر کھڑے سماج کا پورا ڈھانچہ ہلنے لگا۔یہ ایک ایسی روحانی تحریک تھی جو دراصل ایک زبردست انقلابی تحریک تھی۔اسے یوں کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔اگر یہ اسی طرح پروان چڑھتی رہتی تو مقامی گورنر سے لے کر دارالحکومت دہلی تک سونامی کی لہریں جبر و قہر کی ایک ایک اینٹ اکھاڑ پھینکتیں۔ساری دنیا دیکھ رہی تھی کہ عوام الناس سرکاری کارندوں، مذہبی پیشواؤں، جاگیرداروں اور وڈیروں کے سخت ستائے ہوئے تھے۔ یہ عوام اِن ساری شیطانی استحصالی قوتوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے شاہ عنایت کی مریدی اختیار کر کے فقیروں میں آن شامل ہونے لگے تھے۔اور وہیں اکٹھے رہنے لگے تھے۔

لہٰذا کفر کے فتوے شروع ہوئے۔ سرکار، دربار، مسند، ممبر، سب کچھ حرکت میں آ گیا۔ چنانچہ اس تحریک کو تناور ہونے سے قبل ہی ختم کرنے کی ٹھان لی گئی۔

اِدھر شاہ عنایت بھی داؤ پیچ کا ماہر تھا۔ اسے فوراً اندازہ ہوا کہ سلامتی کے دن تھوڑے رہ گئے۔ اس کی تحریک جائیداد و جاگیر والوں کو ہضم نہیں ہورہی تھی۔ مگر یوٹو پیائی ذہن نے بہت بڑے مقابلے کا نہیں سوچا تھا۔ یوٹو پیائیوں میں بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ ترغیب کو سب سے بڑا ہتھیار سمجھتے ہیں۔ مقابلہ، جنگ اُن کے ہاں شورش و فساد ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ نصیحت و مثال سے بہتر کرنا چاہتے ہیں۔............ یہ خاصیت یورپی اور ایشیائی دونوں مفکروں میں موجود تھی۔

چنانچہ شاہ اپنی تحریک کو جنگ کے میدان میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ شاہ غلام محمد کو واپس ہندوستان بھیج دیا۔ اور شاہ اسماعیل صوفی، مسعود و الہاری، شاہ عبدالطیف اور شاہ عبدالکریم ٹھٹھوی کو ٹھٹھہ کا نظریاتی محاذ حوالے کیا اور خود سیکڑوں مریدوں اور فکری ساتھیوں کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں میراں پور میں آ گیا جسے اُس دن کے بعد جھوک کا نام مل گیا(7)۔

جھوک میں وہ اپنا اور اپنے بڑے دائرے (کمیون) کا گزارہ اُسی زرعی زمین کو آباد کر کے کرتا رہا جو اُس کے گھرانے کو بہت عرصہ قبل تیموری سلطانوں سے (ٹیکس وغیرہ سے معاف) ملی ہوئی تھی(8)۔ پہلے سے شہرت یافتہ ''دائرہ'' کچھ ہی عرصے میں عقل و عرفان و تفکر کا مرکز بنا۔

دنیا کے سارے بڑے نظریات اپنے عہد میں موجود ماحول، اور اپنے سے قبل گزرے ہوئے نظریات کا مرکب ہوتے ہیں۔ شاہ عنایت کا نظریہ بھی سماج ہی کی پیداوار تھا۔ بہت سے دانشوروں اور تاریخ دانوں کی تحریریں اِس بات پر متفق ہیں کہ شاہ عنایت، محمد جونپوری (1443-1505) اور اس کی مہدوی تحریک سے اچھا خاصا متاثر تھا، جو کہ جام نندہ کی حکمرانی کے زمانے میں ڈیڑھ دو سال ٹھٹھہ میں قیام کر چکا تھا(9)۔ جونپوری کی تعلیمات مشترکہ زمین، مشترکہ زراعت، اجتماعی پیداواری عمل اور ہر ایک کی ضرورت کے مطابق اناج کی تقسیم کے متعلق تھیں۔ اُس کے پیروکاروں اور شاگردوں کو ذات، عقیدہ اور طبقہ کی وابستگیاں ختم کر کے برابری کی زندگی گزارنی تھی۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ شاہ شہید نے صرف جونپوری کی تعلیمات سے ہی استفادہ نہ کیا، اس نے تو دنیا بھر کی انقلابی تحریکوں سے مناسب باتیں لے لیں۔ مطالعہ سے بھرا یہ شخص، مشاہدے کی نعمت سے مالا مال یہ مفکر، بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے سارے نکتے ملا کر اپنا فلسفہ تشکیل دینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے خود کو مہدی وغیرہ ہونے کے کوئی القابات نہ دیے۔ نہ ہی مہاتما بدھ بنا۔ اس نے ہر فلاسفر کی تعلیمات سے اپنے لیے کارآمد باتیں لیں اور اُس وقت تک اِس منطقے میں موجود تقریباً سارے نظریات میں سے واضح ترین نظریہ پیش کیا۔

شاہ عنایت کا دانشوارانہ کمال یہ ہے کہ اس نے نہ صرف موجود کو ناقابلِ قبول قرار دے کر مسترد کیا، نہ صرف اُس زمانے کے رائج ظلم، ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ کے نظام سے بغاوت کی بلکہ اُس نظام کا متبادل نظام فراہم کیا۔ اس نے ''اُم الخبائث'' یعنی ذاتی ملکیت کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے کا تصور دے دیا۔ اور حقیقی معنوں میں ایک بیت المال قائم کر دیا۔ جس کے بعد تو آٹو میٹک انداز میں امن، آشتی، پیار، اتحاد، مساوات اور اشتراکیت کے نظام نے صورت پذیر ہونا تھا۔

ایک اور خاص بات یہ ہے کہ شاہ عنایت ترکِ دنیا والا پیر نہ تھا۔ اس کی باقاعدہ ازدواجی زندگی تھی۔ اُس کی آل اولاد تھی۔ اُس کے بڑے بیٹے کا نام شاہ خلیل اللہ تھا جبکہ دوسرے کا عزت اللہ شاہ تھا اور تیسرے بیٹے کا نام سلام اللہ تھا۔ وہ بلاشبہ صبر کی تلقین کرتا تھا مگر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنے والا صبر نہیں بلکہ متحرک طور پر انسانوں کی بھاری اکثریت کی فلاح کی خاطر ہر دم محنت کرنے کی تلقین کیا کرتا تھا، تاکہ دنیا کو تبدیل کیا جائے۔

شاہ عنایت نے سب سے پہلے خود اپنی آبائی زمین مشترکہ ملکیت قرار دی اور محنت و پیداوار دونوں میں مساوی شرکت کا اصول جاری کیا۔ اس کے مریدوں، گاؤں والوں، اور اہلِ خاندان نے اس اقدام کو بہت پسند کیا۔ چنانچہ وہ سب اکٹھے اس کھیت پر محنت کرنے لگے اور پیداوار کی تقسیم کے وقت برابری کرنے لگے۔ یہاں زمین، چوپائے، مال مویشی، زرعی اوزار اور دیگر اشیا کسی ایک فرد کی ذاتی ملکیت نہ تھیں، بلکہ یہ ساری اشیا مشترکہ ملکیت کی تھیں۔ گینتی بیلچہ

چلانے، کلہاڑی استعمال کرنے، ہل چلانے، پانی لگانے، مال چَرانے یا کسی اور کام سے کوئی بھی بالا اورآزاد نہ تھا۔ جھوک کے اس نئے سماج میں کمانڈر اور مرشد سمیت سب کام کرتے تھے۔ دوسرے کی محنت پر پلنا بے عزتی سمجھی جاتی تھی۔ یہاں کوئی سماجی، نسلی، مذہبی اور قبائلی امتیاز موجود نہ تھا، کسی قسم کی بڑائی چھوٹائی موجود نہ تھی۔ اس طرزِ زراعت میں شامل لوگ بہت مطمئن ہوئے اور اُن کی مالی حالت سدھر گئی۔ وہ سب سماجی طور پر آزاد انسان بنے۔

شاہ عنایت اپنے پیروکاروں میں صرف دولت اور ضروریاتِ زندگی کی مساویانہ تقسیم کی بات نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ تو پیداواری عمل میں، محنت مشقت میں بھی مساوی شرکت کو اہم گردانتا تھا۔ پیداواری عمل میں مساوی شرکت کے بغیر پیداوار کو مساوی بانٹنے کی بات ہی عقل و دلیل کے خلاف تھی۔ شاہ عنایت نے قانونِ معیشت کا یہ راز پالیا کہ اصل چیز پیداواری عمل ہے اور اصل مساوات وہ ہے جو پیداواری عمل کے دوران قائم ہو، نہ کہ محض تقسیم کے دوران۔ تقسیم کے دوران مساوات والی بات تو ڈاکوؤں کے ہاں بھی قائم ہے جو لُوٹ کا مال باہم بانٹ لیتے ہیں۔ اصل مساوات تو محنت کرنے کے اندر ہوتی ہے۔ پیداواری عمل میں مساوی شرکت کے بغیر مساوات ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا شاہ عنایت نے پیداواری عمل میں مساوی شرکت پر زور دیا۔ اُس کا پکا عقیدہ تھا کہ کھیتی باڑی اجتماعی اصولوں پر کی جائے، پیداواری عمل میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں اور وہ فصل کو حسبِ ضرورت آپس میں تقسیم کریں۔ کوئی مالک نہ ہوگا، کوئی محکوم نہ ہوگا۔ کوئی حاکم نہ ہوگا، کوئی محکوم نہ ہوگا۔ سب ایک جیسے ہوں گے۔ سب محنت کریں گے اور سب خوشحال ہوں گے۔ شاہ عنایت کے کامریڈوں نے اس فلسفے پر عمل کیا اور بہت کامیاب ہوئے۔ (ہمیں مشرق پہ تکبر تو نہیں، مگر فخر ضرور کرنا چاہیے)۔

اب یہ ساری بات تو بالکل ہی نئی بات تھی۔ حکمران اُن مذہبی علوم اور پیری فقیریوں سے خائف نہیں ہوتا جن کا تعلق قیامت و آخرت سے ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسے علوم نہ تو قلب سے غفلت کی کائی دور کر سکتے ہیں، نہ آنکھوں سے عمایت کے پردے، بلکہ ان میں انہماک رکھنے والے عموماً ایک طرح کے مجنون اور مخبوط الحواس لوگ ہوتے ہیں جنہیں عملی زندگی اور دنیا کے سود و بہبود سے کوئی تعلق

نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے ایسے از کار رفتہ لوگوں سے حکمران کو کیا خوف ہو سکتا ہے؟ شاہ عنایت کے اُس زمانے کی پیری فقیری میں تو دستور یہ تھا کہ وہاں صبر و رضا کی تلقین کی جاتی تھی۔ خود تو دولت جمع کی جاتی تھی مگر مریدوں کو دنیاویت سے فرار سکھایا جاتا تھا۔ جھمگھٹوں سے دور، فرار کی ایک آماج گاہ بنا کر انسانی حقیقی مصائب و دکھ دلوں دماغوں سے گم کر دیے جاتے تھے۔ حقوق کے لیے ہر طرح کی جدوجہد کو دنیاوی کام گردان کر، اسے حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ اور حال اور مستقبل قریب کی درندگی والی زندگی کو بدلنے پہ غور کرنے کی بجائے مستقبل بعید اور موت کے بعد کے حالات پر غور و خوض فرمایا جاتا تھا۔

اب اچانک صدیوں سے جاری اس مروج کے خلاف ہزاروں انسان اٹھ آئے تھے۔ گھر بار چھوڑ دیے، جاگیرداروں کی غلامی میں اگائی گئی اپنی کھڑی فصلیں ترک کر دیں۔ ملاّ، پیر اور حاکم کی صبر و شکر کی خانقاہیں چھوڑ دیں............اور سب اِس نئے طرز میں آن شامل ہوتے گئے۔ نتیجے میں آستانیں، خانقاہیں، حجرے خالی ہوتے رہے اور جتماعی کاشت کاری کے فلسفے سے وابستگی قبولیت پاتی گئی۔ ''چندروزہ زندگی'' کا فلسفہ ہار گیا اور ''عدم مساوات خدا کی طرف سے ہے'' والے فلسفے کو بھی شکست ہوگئی۔ اور اس کے مقابلے میں ''زمین اللہ کی'' کا فلسفہ جیت گیا۔ ''جو بوئے وہی کھائے'' والی بات پذیرائی پاگئی۔

ایسا نہیں ہے کہ محض سب مل کر مشترکہ زمین پہ محنت مشقت کرنے لگے۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ جب فصل اٹھانے کا وقت آجاتا تو ہر محنت کش اپنی ''ضرورت کے مطابق'' اناج لے جاتا۔ اور باقی پیداوار دائرے (اجتماع) کی ملکیت رہتی تا کہ دیگر ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری ہوں۔

............اور، یہ سب کچھ بے گار، ٹیکس، چھیڑ، اور مالیہ سے پاک جھوک میں کامیابی سے چل رہا تھا۔ اور یہاں تو ایک انقلابی روح اگ آئی تھی۔ ایک متوازی مرکز جہاں جاگیرداروں کے ظلم سے بھاگے مظلوم لوگ پناہ لیتے، جہاں پیری مرشدی کے نام پہ جبر و استحصال کی خانقاہیں سجائے اڑوس پڑوس کے پیروں کے مرید بھاگ بھاگ کر آغوشِ مساوات میں امان پاتے۔ محنت کرتے،

عزتِ نفس پاتے اور ایک حقوق یافتہ شہری کے بطور اپنی محنت کا ثمر پاتے۔صرف یہی نہیں بلکہ اب تو
جاگیرداروں اور دنیادار پیروں کے غلام کسان ومرید یہ مطالبہ بھی کرنے لگے کہ اُن کے علاقے میں
بھی ''دائرہ'' (کمیون) قائم کیا جائے۔

اس مقبولِ عام اجتماعی طرزِ زندگی نے ظاہر پرست مذہبی اجارہ دار ملاؤں، پیروں
فقیروں، زوال پذیر مغل سلطنت کے نائب مغل امرا اور ان کے حامی و پٹھو مقامی جاگیرداروں
اور زمینداروں کو خائف کر دیا۔ جائیداد تو اُن کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہوتی ہے۔جاگیرداری
نظام کی چولیں ہلنے لگیں۔چنانچہ یہ لوگ ٹھٹھہ چلے گئے اور وہاں گورنر میر لطف علی خان سے سارا ماجرا
بیان کیا۔حالانکہ گورنر خود اس تحریک کی مقبولیت اور اس سے بادشاہی نظام کو درپیش خطرے سے آگاہ
تھا مگر چونکہ شاہ عنایت کی زمین پر سرکار کا اختیار نہیں چلتا تھا، اس لیے سرکاری مداخلت نہ کی گئی۔مگر
گورنر نے وفد کو اجازت دی کہ وہ جس طرح جی چاہے اس مسئلے کو حل کرے، سرکار اُن کے راستے میں
رکاوٹ نہیں بنے گی۔

یہ زمیندار، پیر، ملا اور جاگیردار لوگ تو پہلے ہی طاقت کے زور سے اس مقبولِ عام تحریک کو
دبانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ردِانقلاب والی اس جماعت میں پیر عبدالواسع شامل تھا، علاقے کا سب
سے بڑا جاگیردار اور ہاریوں کا استحصال کنندہ حمل جت موجود تھا، اور ایک دوسرا بڑا جاگیردار نور محمد پلیجو
بھی موجود تھا۔چنانچہ اِن سب بااثر لوگوں نے نہتے کسانوں کی اجتماعی کاشت کاری کو تباہ کرنے کے
لیے آدمی اکٹھے کرنے شروع کر دیے............جن میں علاقے کے ڈاکو بھی شامل تھے۔

یہ ساری ظلمت پرست فوج رات کے اندھیرے میں فقیروں کے جھوک پر حملہ آور ہوئی۔
اس حملے کی قیادت نور محمد پلیجو نے خود سنبھالی۔قتل وغارت کا بازار گرم ہوا۔جھوک کمیون کے فکری ساتھی
اپنے مرشد اور اپنے اجتماعی زرعی نظام کے دفاع میں شہید ہوتے گئے مگر شاہ عنایت اور کمیون ہیڈ
کوارٹر کو کوئی گزند پہنچنے نہ دی۔دوسرے دن فقیروں نے اپنے ساتھیوں کی میتیں اٹھائیں۔پینتیس
جنازے ایک بار اٹھے (10)۔

شاہ عنایت ذہنی طور پر اس ردِانقلاب کی کوشش کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔اُس کے
نہ تو اوسان خطا ہوئے، نہ اُس کے ہونٹ خشک ہوئے اور نہ انگلیاں کانپیں۔اس مدبر نے نہ صرف
عوام کے بپھرے جذبات پہ قابو پایا بلکہ کمال مہارت اور ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے تختِ دہلی کو اپنی
طرف کرنے کا فیصلہ کیا۔اس نے ایک خط لکھ کر شہیدوں کے ورثا کے حوالے کیا اور انہیں ایک وفد کی
صورت مغل شہنشاہ، فرخ سیر کے دربار میں دہلی بھیجا۔یہ خط نہ صرف آپ کو شاعری لگے گی بلکہ اس کا
اختصار میں ہونا، اور بہت ہی بالواسطہ ہونا آپ کو حکمتِ عملی کے اُس بڑے ماہر کی عظمت دکھلا دے گا:

"بسم الله الرحمن الرحيم

الـله بس است و ما سوا هوس است. ذكر المولىٰ
مـن كل اولىٰ. اهلِ ياد هميشه شاد. از شدتِ دارين آزاد.
بيدارىِ شب نعمتِ عجب، شرف و ثواب. ذكرِ مدام فكر
ِتمام. امروز دشت و ميدان است و گوئى و چوگان
است. فردانه دشت نه ميدان است و نه گوئى و
چوگان است. زود بتازكه وقت مجرائى رحمان است.
بيدار باش و هوشيار باش. نمى گويم كه از عالم
جداباش، بهر حالے كه باشى با خدا باش.

فقير عنايت الله صوفى القادرى از ميرانپور

ترجمہ:

اللہ بس، باقی ہوس۔مولیٰ کا ذکر سب سے پہلے، اہلِ یاد ہمیشہ شاد، شدتِ دارین
سے آزاد۔بیداریِ شب نعمتِ عجب' شرف وثواب ذکرِ مدام فکر تمام' آج دشت و
میدان ہے ذکر و چوگان ہے۔کل نہ ہوگا دشت و میدان نہ ذکر و چوگان۔تیز
بھاگ کہ وقتِ مجرائی رحمٰن ہے' بیدار ہو جا ہوشیار ہو جا' میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا سے

الگ تھلگ ہوجاؤ، مگر جس حال میں رہو خدا کے ساتھ رہو"۔

شاعری میں لکھی گئی یہ نثر کسی ترجمے کی محتاج تو نہ تھی۔"ازطرف" کے خانے میں کوئی غلامی وآقائی، یا رعایا وحکمرانی کا عندیہ تک نہ تھا۔صرف "فقیر عنایت اللہ صوفی القادری، ازمیرانپور" لکھنا کافی جاتا۔

اس مختصر خط کو لے کر وفد فرخ سیر کے دربار پہنچا۔وہاں وفد نے زمینداروں کی لاقانونیت، اورظلم کے خلاف مکمل تفصیل بتائی۔اورولی و بزرگ شاہ عنایت کا خط پہنچایا۔

شاہی دربار میں فیصلہ ہوا کہ قاتلوں یعنی پیر عبدالواسع ،جمل جت اور نور محمد پلیجو کی زمینیں قصاص میں شہید ہونے والے فقیروں کے ورثا کو ملیں۔

جب یہ زمینیں فقیروں کو ملیں تو ان پر بھی کاشتکاری کا وہی نظام رائج کیا گیا جو اس دھرتی پر شاہ عنایت نے شروع کیا تھا۔یوں اب بڑے علاقے کی زمینیں مشترک تھیں اور وہاں کی آبادی آپس میں مل کر اجتماعی کاشتکاری کرنے لگی۔

سندھ کے لازوال اورامر انقلابی،شاہ عنایت کا مساوات اور بھائی چارے کا نظام جاری و ساری تھا۔ عدم استحصال پر مبنی اس نظامِ کاشت نے ہاریوں اورغریبوں میں اتنی مقبولیت پائی کہ آس پاس کے کاشتکار اور بے زمین ہاری وڈیروں کی کاشتکاری چھوڑ کر اپنی چھوٹی موٹی زمینوں کے ساتھ جھوک کی اجتماعی کاشتکاری کے حلقہ بگوش ہوتے گئے (11)۔چنانچہ بہت مختصر وقت میں بے شمار لوگ اس کمیون اوردائرے میں شامل ہوگئے۔دائرے نے ہزاروں برس قبل والی قدیم کمیونزم کے بعد اب دوبارہ ایشیا کی سماجی تاریخ میں اجتماعی کاشت کاری رائج کر دی ۔جھوک پہلا کمیون بنا جہاں فقیر پیداواری عمل میں مساوی حصہ لیتے تھے اور ایک خاندان کی طرح پیداوار سے مستفید ہوتے تھے۔اپنی پیداوار کا معمولی حصہ دائرے میں پڑے ہزاروں مفلوجوں اور معذوروں کی روٹی (لنگر) کے لیے دینا ہوتا تھا۔اورلنگر میں قانون تھا کہ؛

آں کس کہ بہ ایں جامی آید

نانش به دهیداز ایمانش نه پرسید

پاک ارواح پاکیزہ قلب، سخی دل،لوگوں کو ایک پاک صاف انسانی ماحول میسر آ گیا تھا۔ ہرفرد اجتماع کے لیے تھا اور اجتماع ایک فرد کی خدمت پہ مامور۔ہر نیکی کرنے کے لیے آزاد۔آزادی تو ہوتی ہی نیکی کرنے کی ہے۔باقی آزادیاں تو بس این جی اوگیریاں ہیں۔چنانچہ دیکھتے دیکھتے دائرے سے وابستہ عوام کی زندگیوں میں صفتی بہتری آئی۔ اِس کمیون کے کاشتکار (فقیر) جاگیرداروں کے ہاریوں کی بہ نسبت بہت خوشحال ہو چکے تھے۔شاہ عنایت اور اُس کی اجتماعی کاشتکاری کی شہرت دور دراز تک پہنچتی۔آس پاس اوردور دراز کے فیوڈلوں کے مفلس مزارع وہاں سے بھاگ بھاگ کر اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس درویش کے "مشترکہ اقتصادی نظام" کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتے گئے۔

صوفی شاہ عنایت کی یہ انقلابی تحریک" زمین اللہ جی آہے ،جیکو کھیڑے سو کھائے" (زمین خدا کی ہے، جو اُگائے وہ کھائے یا، ہر کسّے کیڑی واڑت دِہ ہماں) کے نعرے تلے تیزی سے پھیلنے لگی۔

سگِ دنیا......ردِ انقلابی ہوتا ہے

جاگیرداروں کے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اس لیے کہ نہ صرف عوام الناس پر اُن کا اثر اور رعب ختم ہو رہا تھا بلکہ اُن کی زمین پہ کاشتکاری ہونے تک کو خطرہ ہوا۔ مزارع ملنا مشکل ہو گیا تھا۔

شاہ عنایت کے انقلابی کمیون، جھوک میں آباد فقیروں کو نہ بٹائی دینی پڑتی، نہ بیگار کرنی پڑتی، اور نہ پٹواری قانون گو کو کچھ دینا پڑتا تھا۔ ایسے باوقار سماج کی شہرت کو تو تیزی سے دور دور تک پھیلنا تھا، سو بغیر اخبار ٹی وی کے ہر جگہ اس نئے تجربے کا چرچا ہونے لگا(12)۔ صرف اجتماعی کاشتکاری ہی کی حاصلات نہ تھیں، بلکہ حاکموں کے نظام، ٹیکسوں میں مسلسل اضافے اور غلط زمینداری نظام نے بھی ہزاروں کسان خاندانوں کو اس انقلابی تحریک کے مرکز جھوک شریف میں اس ''اھل اللہ'' (شاہ عنایت) کی پناہ میں جمع کر دیا۔ باقی علاقوں کے جو مزارعے یہاں تک نہ آ سکتے تھے، انہوں نے جب بھی موقع پایا زمینداروں سے مطالبہ کر ڈالا کہ ہماری زمینوں پر بھی عنایت شاہ کے طریقے پر عمل کیا جائے۔ کچھ کمزور فیوڈل علاقوں میں یہ اصلاحات جزوی یا پورے

طور پر نافذ بھی کر دیں۔ الغرض کئی اضلاع میں شاہ عنایت کی ہاری تحریک پھیلتی گئی۔ کسان جہاں جہاں موقع ملتا پر ایسی خانقاہیں قائم کرتے اور اُس دائرے میں طلبا، مسافروں اور غربا و مساکین کے لیے عام لنگر قائم کرتے۔

دوسری طرف فقیروں کے ''ہمہ اوست'' والے نعرے نے بھی خانقاہی پیروں اور روایتی ملاؤں میں تشویش پیدا کی۔

کسانوں کے اس اجتماع اور فیوڈل مخالف تحریک نے مغل حکمرانوں کی نیندیں بھی حرام کر دیں اور انہیں اپنا اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا۔ اب مغل گورنر نے فقیروں سے پیداوار پر ٹیکس دینے کو کہا۔ مگر فقیروں نے کسی قسم کا ٹیکس دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ان کی زمین خون بہا کا عوض ہے، لہٰذا لگان یا کسی بھی محصول سے مستثنیٰ ہے۔

اُدھر بادشاہ فرخ سیر کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ اسے اس تحریک کے تیزی کے ساتھ پھیلاؤ اور مقبولیت سے خوف آنے لگا۔ اس نے میر لطف علی خان کو فقیروں کے ساتھ نرمی برتنے کے جرم میں اس کے عہدے سے ہٹا دیا اور 1716 میں نواب اعظم خان کو ٹھٹھہ کا صوبیدار مقرر کیا۔

کسان تحریک کے بارے میں پہلے ہی متعصب اعظم خان نے جب اپنا عہدہ سنبھالا تو زمینداروں نے آتے ہی اُس کے کان بھر لیے اور اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

کہتے ہیں کہ وہ موقع پر حالات کا مشاہدہ کرنے، اور اِس کمیون کے نظریاتی و انتظامی سربراہ سے ملنے خود جھوک چلا گیا۔ اُس وقت شاہ عنایت ذکر و عبادت میں مصروف تھا۔ درویشوں نے اسے کچھ انتظار کرایا۔ جب ذکر و فکر کا دورانیہ ختم ہوا تب اسے شاہ عنایت سے ملوایا گیا۔ ملاقات پہ اعظم خان نے اُس سے کہا:

درِ درویش رادربان نه شاید

(درویش کے دروازے پر دربان اچھے نہیں لگتے)

انقلابی نے فی البدیہہ جواب میں کہا:

به شاید،تاسگِ د نیا نیا ید

(ٹھیک ہے تا کہ دنیا کا کتا اندر نہ آنے پائے)

مگر، اب تو سگِ دنیا اندر آچکا تھا۔ اس کے غرور کی انا مجروح ہو چکی تھی۔ تکبر، زخمی بھیڑیا بن چکا تھا۔ ارے، یہی تو انقلاب تھا۔ سوشلسٹ انقلاب، جو تین سو سال بعد بھی سندھی فیوڈل کو قابلِ قبول نہیں ہے۔ آج کون ''فقیر'' ہے جو جا گیردار کو کتا کہے۔ اپنی بہادری کے بل بوتے پر نہیں بلکہ مضبوط تنظیم اور عوام الناس کی حمایت کے بل بوتے پر؟۔ کوئی نہیں ہے ناں!

اب حکمران طبقہ طے کر بیٹھا کہ یہ تو باقاعدہ ایک متوازی حکومت تھی، ایک مقبولِ عام متوازی نظامِ حیات تھا!!۔ اس کی جڑیں اکھاڑ نا ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ جھوک نے سینٹ پیٹر سبرگ بننا تھا۔

لہٰذا نجی ملکیت بپھر گئی، اس کے منہ میں جھاگ، آنکھوں میں وحشت اور زلفوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اس کے ہونٹ دانتوں میں دب گئے، اس کی انگلیاں مکّے میں اکڑ گئیں اور اس کا غصہ مرتکز و مجتمع ہونے لگا۔

نجی ملکیت کے چوکیدار گورنر اعظم خان نے لگان دینے سے فقیروں کے انکار کو بہت بڑھا چڑھا کر فرخ سیر کو رپورٹ روانہ کر دی۔ فیوڈل بادشاہت کو جب یہ رپورٹ پہنچی کہ شاہ عنایت اپنے نظریے کے ذریعے ایک علیحدہ سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے تو پھر تو بادشاہ غصے سے بپھر گیا۔ اسی تخت کو بچانے تو بھائیوں نے بھائیوں کو، بیٹوں نے باپ کو کالی اور نم بھری جیلوں میں جھونک رکھا تھا۔ اور باپوں نے بیٹوں کی آنکھیں نکال دی تھیں۔ اور یہ حقیر فقیر؟۔ ارے اِس کی کیا مجال کہ نہ تو وہ نواب ہے، نہ جرنیل ہے، اور نہ ابھی تک اُس کا کوئی سماجی سیاسی مقام رہا ہے۔.......... چنانچہ گورنر نے فقیروں کو نیست و نابود کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

تب نواب اعظم خان، یار محمد کلہوڑا اور دوسرے سارے جا گیرداروں نے اپنی ذاتی افواج اکٹھی کیں اور یہ ساری قوتیں شاہی فوج سے مل گئیں۔ اس مشترکہ بہت بڑی فوج نے 13 اکتوبر 1717 میں جھوک کا محاصرہ کر لیا۔ ہمارے بلوچ وطن کے سبی اور گنداواہ اُس وقت کلہوڑوں (دراصل مغلوں) کے قبضے میں ہوا کرتے تھے۔ اور وہاں باقاعدہ شاہی فوج ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جھوک کا محاصرہ کرنے والی اِس فوج میں سیوی اور ڈھاڈر سے بھی فوجی منگوائے گئے تھے۔

اس جنگ کے لیے یار محمد کلہوڑا نے اپنا سب کچھ جھونک ڈالا۔ اس نے نہ صرف اپنی سٹینڈنگ آرمی بھیجی بلکہ اس نے خود، اپنے بیٹے محمد خان، بھائی میاں میر محمد خان، یعنی لگ بھگ اپنے پورے خاندان کو ساتھ لے کر اس جنگ میں حصہ لیا۔ (جی ہاں، طبقاتی جنگ میں بالائی طبقہ بھی اپنا سب کچھ جھونک دیتا ہے!!)۔

اس فوج میں میر شہداد بلوچ بھی شامل تھا۔ نیز چانڈیوں کی سلطنت ''چانڈ کا'' (لاڑکانہ) کی افواج بھی اِس سرکاری اور فیوڈل فوج میں موجود تھیں۔

اسی طرح سید عبدالواسع اپنی پیری مریدی کی تمام قوت کے ساتھ کمیون مخالف جنگ میں جا گیرداروں اور مغلوں کی صف میں تھا۔ یہ واسع منظور کو وہ یار کی تحریر کے مطابق رشتے میں شاہ عنایت کا ہم زلف تھا(13)۔ نور محمد پلیجو اور حمل جت کی متاثرہ جا گیریں بھی نجی ملکیت کے دفاع کے معرکے میں شاہ عنایت مخالف افواج میں آن ملیں۔ مغل افواج (ترک اور افغان سپاہ پر مشتمل) تو تھیں ہی۔ اس کے علاوہ بادشاہی حکم نامے کے تحت ملتان کے صوبیدار حسن خان نے اپنے بیٹے کی قیادت میں ایک بڑی فوج تیار کر کے کسان تحریک کو کچلنے کے لیے بھیج دی۔

اس بہت بڑی فوج کے علاوہ چھوٹے موٹے پیروں، ملّاؤں اور وڈیروں کے دستے بھی ردِ انقلاب کی اِس جنگ میں شامل ہو گئے..........ساری فیکلٹیز مجتمع، ساری لوازمات مرتکز، ساری قوتیں موجود......مراعات یافتگی اپنی بقا کے لیے جان لڑا دیتا ہے۔

ایسی بڑی فوج تو کسی سپر پاور سے لڑنے کے لیے جمع کی جاتی ہے۔ آپ اس کی تعداد، اس کے حجم اور اس کے اسلحہ کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو ''مقالات الشعرا'' کے مصنف کی زبانی سن لیں:

"........... **میاں یار محمد وسایر زمینداران وجملگی اهل و احتشام این الکه،**

احکامِ اعانت حاصل کردہ باافواجِ بیرون ازاحاطۂ شمار و ازموروملخ بسیار کہ از حدِ سیوی، ڈھاڈر، تاکنارہ د ریائے شور جمع آمد بود برفقرا گرد آمد ند" (14)۔ (اعظم خان نے' میاں یار محمد کلہوڑہ، تمام زمینداروں اور اس خطے کے ان تمام لوگوں کے نام معاونت کے احکام حاصل کر لیے تھے۔ یوں ایک ایسی فوج تیار کر کے فقیروں پر حملہ کیا جو شمار نہیں کی جاسکتی تھی اور چیونٹیوں، ٹڈیوں سے بھی زیادہ تھی اور سبی و ڈھاڈر سے لے کر سمندر کے کنارے تک سے جمع کی گئی تھی)۔

یار محمد کلہوڑہ بھی جب سازش میں شریک ہوا تو لوگوں نے شاہ عنایت کو اُس کا وہ قول یاد دلایا جب اس نے اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر شاہ عنایت سے وفادار رہنے کا کہا تھا۔

شاہ نے یہ جواب دیا:

ڈونگر ڈنی ڈاڑھی، کو ہ کتے جو پچھ

(یار محمد نے داڑھی پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے وعدہ کیا تھا لیکن وہ داڑھی نہیں کتے کی دم تھی)(15)

واضح رہے کہ یہ افواج اُس وقت کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھیں۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں اور توپیں بھی۔ اور انہیں انہوں نے استعمال بھی اندھا دھند کیا تھا۔ بی بی سی، سی این این اور جیو، اے آر وائی ٹی وی کے بطور اس زمانے کا میڈیا، یعنی سرکاری درباری شاعر، اور فتویٰ دینے والے ملاّ مفتی اس کے علاوہ تھے، جو بہت مستعدی اور ذمہ داری سے عوام کو شاہ عنایت سے بدظن کرنے کے اپنے اپنے شعبوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔

دوسری طرف 24 ہزار کسان تھے جن کے پاس گینتی بیلچہ کے علاوہ کوئی اوزار ہتھیار نہ تھے۔..........بس انقلابی تعلیمات تھیں، دائرہ (کمیون) میں اجتماعی زندگی گزار کر اُس کے فوائد دیکھ رکھے تھے اور دوبارہ غلامی میں نہ جانے کا عزم تھا۔ ایک طبقاتی فولادی اتحاد تھا اور جنگ کے بارے میں دیہی بصیرت، وژن اور آباؤ اجداد کے تجربات تھے۔ لہٰذا آزادی کی سلطنت کی راہ میں کندھے سے کندھا ملائے جنگ کرتے ہوئے بڑھنے کے علاوہ کوئی متبادل تھا ہی نہیں..........اور جنگ کا طبل

تو دشمن بجا چکا تھا۔

میدانِ جنگ کا احوال کسانوں کے طبقاتی دشمن ہی کی زبانی دیکھیے۔ محاصرہ کرنے والی فیوڈل افواج کے ایک اہم کمانڈر میاں یار محمد کلہوڑا نے اپنے بیٹے کو ایک خط لکھا، جس میں اس نے لکھا کہ: ''فقیروں نے قلعے کے اطراف خندق کھود رکھی ہے اور اسے پار کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ اسی لیے سرکاری لشکر کو جھوک سے نصف کوہ پرے رکنا پڑا'' (16)۔

یہ حملہ صرف شاہ عنایتؒ اور اُس کے دربار پہ نہ تھا، بلکہ یہ جنگ تو اُن سارے مفلسوں اور مظلوموں کے لیے موت و زیست کی جنگ تھی جو بڑے بڑے جاگیرداروں کی زمین چھوڑ کر اس ''اجتماعی اقتصادی نظام'' میں آ کر آزادی پا چکے تھے۔ یہ صرف زنجیریں کھونے کی بات نہ تھی بلکہ اُس سے کئی گنا بڑی جنگ تھی اس لیے کہ زنجیریں تو ٹوٹ چکی تھیں اور آزادی تو ''دائرہ'' کی صورت حاصل کی جا چکی تھی۔ ادھر تو سپارٹیکس والی حاصل کردہ اس آزادی کو کھونے کی بات تھی۔ دوبارہ تباہ کن غلامی میں جانا، موت سے بدتر تھا۔ اگر یہ نظام برباد ہو جاتا تو اُن کے لیے وہی اندھیر نگری والی اندوہناک زندگی تھی جہاں افلاس، بھوک، غلامی، ذلت، خواری اور دربدری ہوتی (17)۔

وہ اُس دوزخ میں دوبارہ جانا نہیں چاہتے تھے جہاں غیر متوازن معاشی نظام میں اُن کے آزاد کردہ جسم، ذہن اور فکر دوبارہ زنجیروں میں جکڑے جانے تھے۔ غلام کو زنجیروں میں ڈالنا اس قدر ہولناک بات نہیں ہے جتنا کہ غلامی سے آزادی حاصل کرنے والے کو دوبارہ زنجیریں پہنانا۔ یہ تو قہر ہوتا ہے!!۔ اسی لیے آزاد شدہ کسان شاہ عنایتؒ کے فلسفے ''الارض اللہ'' کو جھنڈا بنا کر پورے ایمان اور عقیدے اور کمٹ منٹ کے ساتھ مزاحمتی جنگ میں کود پڑے۔ تخت یا تختہ کے علاوہ کوئی اور راستہ تھا ہی نہیں!!۔ اچھے لوگو! ''الارض اللہ'' کا نعرہ آپ نہیں اپنا سکتے کیا۔ ذرا غور تو کیجیے آپ مصنوعی نعرے بناتے رہتے ہیں، جبکہ یہ نعرہ نہ صرف ہماری تہذیب و ثقافت و اذہان کے لیے مسرت آمیز ہے بلکہ اس قدر عملی بھی ہے جس نے چار ماہ تک نہتے کسان مردوں عورتوں کو وقت کے سپر پاور سے ٹکرا جانے کے قابل بنایا۔ ایسا کارآمد نعرہ جس نے 24 ہزار سربازوں کو اپنا سر قربان کروانے کے قابل بنایا......

لہٰذا انقلابیوں نے اپنی جنگ جاہ کے اطراف گہری اور وسیع خندق کھود ڈالی، اسے پانی سے بھرلیا۔ جو آئے غرق ہو جائے۔ اتنا وسیع خندق کہ دشمن کا تیر و سنگ پہنچ ہی نہ پائے۔ اندر قلعہ بند ہو کر لڑنے کی سٹریٹجی بنا کر طویل عرصے کا راشن پانی جمع کیا گیا۔

درویشوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے جتھے بناتے تھے، رات کے وقت نکلتے تھے اور محاصرہ کرنے والوں کو چُھپ کر مارنے کے لیے چھاپہ مارتے تھے۔ یعنی دشمن کو حملہ نہ کرنے دینا، اور خود اس پر چھوٹے چھوٹے مگر مہلک حملے کر کے اسے نفسیاتی طور پر زخمی زخمی کر دینا۔ خود اُن کے دُہائی دینے والے مسودوں اور تحریروں میں آپ کو ملے گا کہ جاگیرداروں اور پیروں کی فوجیں اس طرح کے شب خون حملوں میں کتنی بری طرح کٹتی رہیں(18)۔

حالانکہ شاہ عنایتؒ نے باہر سے کسانوں کو جھوک آنے سے منع کیا تھا۔ مگر اب یہ جنگ صرف کمانڈر کی تو نہ تھی۔ یہ تو پورے غریب طبقے کی جنگ بن چکی تھی۔ اس لیے شاہؒ کے منع کے باوجود طبقاتی اتحاد، کسانوں کو میدانِ جنگ کی طرف کھینچتا رہا۔ جنگ طول پکڑتی گئی۔ جب دو ماہ تک یہ جنگ جاری رہی تو ہمیں اس دوران ملتان کے صوبیدار سید حسین خان کے بیٹے کے خط کے ذریعے جھنجھلاہٹ کی ایک جھلک ملتی ہے۔ یہ خط اِس نے جھوک سے لکھا تھا۔ واضح رہے کہ یہ بھی دشمن فوج کا بیان ہے:

''بد بخت فسادیوں نے قلعہ کے اندر سے تیر و تفنگ کی جنگ جاری رکھی ہوئی ہے۔ فوج دو ماہ سے جانفشانی کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہے۔ قلعے کے چہار اطراف پانی سے اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ چاروں طرف سے دس کوہ تک خشکی کا نشان تک نہیں ہے۔ نواب صاحب نے ملتان کے محمد باقر بخشی کو لشکر کے لیے کمک دے کر روانہ کیا۔ اُن کے پہنچنے کے بعد خان بلند مکان سعادت خان خود بھی فوج لے کر صاحبزادہ کے پاس آئے۔ صبح کے وقت صاحبزادہ بڑے بخت کے ساتھ ہاتھی پر پالکی رکھوا کر سوار ہوئے اور لشکر بھی پانی سے بھرے اس کھڈے کو پار کر کے شاہ عنایت کے قلعے کے قریب پہنچ کر مورچہ زن ہوا۔ شاہ عنایت کے لوگ سعادت خان کے مورچے پر شب خون مارنے آئے اور سخت لڑائی ہوئی............''(19)۔

ارے بابا اگر مرنے کو کوئی مقصد ہو تو انسان مرجانے سے نہیں ہچکچاتا۔ اور یہی تو جھوک کے کسان کی قوت تھی۔ جھوک انقلابی کسی پشیمانی کے بغیر ہنس کر موت سے ہم آغوش ہو سکتا تھا، اس لیے کہ اسے پتہ تھا کہ وہ سچ پہ ہے۔ رہی بات ڈسپلن کی تو طویل جنگ تو خود ہی ڈسپلن کی دادی ہوتی ہے۔ انقلابی جنگ مورچے کے انتخاب کا موقع نہیں دیتی، وہ تو آٹو میٹک طور پر آپ کو وہیں لا کھڑا کر دیتی ہے جہاں آپ کی سب سے زیادہ ضرورت ہو۔

آیئے اپنے لیے کچھ نفرتیں اور سمیٹیں۔ اور وہ سرکاری درباری شاعری بھی دیکھ لیں جو ایک لحاظ سے اس لڑائی کی سرکاری رپورٹ ہے۔ ہم ابھی تک تو دوسرے کاموں میں مصروف ہیں مگر جب بھی ہم معرکہ کی ٹھان لیں گے اور صفیں آراستہ ہوں گی تو سی این این و بی بی سی سے لے کر مقامی مسجد کے لاؤڈ سپیکر تک ہمیں بھی یہ حقیر گالیاں ملیں گی۔ گالیوں بھری شاہی افواج اور کسانوں کے تقابل میں یوں ہمیں برا بھلا کہا گیا ہے:

سپاهِ پادشاهی فتح یابان
عدو از سوز غم بس دل کبابان
سپاهِ پادشاهی در شکر خند
عدو چون غنچه دستار از سر افگند
سپاه پادشاهی دل کشاده
عدو چوں بوم در ویران فتاده
سپاهِ پادشاهی شاد و فیروز
عدو و لشکرش، نا شاد و دل سوز
سپاهِ پادشاهی پُر نشاط است
عدو هر دم به غم هم ارتباط است
سپاهِ پادشاهی رو به شادی

عدو عاجز بدستِ نا مرادی
سپاهِ پادشاهی پُر شکوه است
عدو از جان خود هر جا ستوه است
سپاهِ پادشاهی دل خروشاں
عدو چو مردگان از لب خموشاں
سپاهِ پادشاهی نصرت اندوز
نشسته بر عدو پیلان جگر دوز

ترجمہ:

بادشاہی فوج فتح یاب ہے
دشمن کا دل سوزِ غم سے کباب ہے
بادشاہی فوج مسکرا رہی ہے
دشمن نے غنچے کی طرح اپنی دستار سر سے اتار پھینکی ہے
بادشاہی فوج دل کشادہ ہے
دشمن الّو کی طرح ویرانی میں ہے
بادشاہی فوج شاد و کامیاب
دشمن ناشاد و دلگیر
بادشاہی فوج خوش و خرم
دشمن ہر وقت غم و یاس میں
بادشاہی فوج خوشی میں
دشمن نامرادی کے ہاتھوں عاجز
بادشاہی فوج پُرشکوہ

دشمن اپنی جاں سے تنگ
بادشاہی فوج دل ہلا دینے والی ہے
دشمن مُردوں کی طرح خاموش
بادشاہی فوج فتح مند ہے
دشمن جیسے چھاتی پہ تیر لگا ہو

مگر، درباری شاعر کی زبانی یہ بد حال کسان، اُس کے بقول نیچ لوگ مغل بادشاہ کی سمندر و ساحل کی بڑی فوج کو کامیابی سے روکے ہوئے تھے۔ محاصرے کی حالت میں، خوراک کی قلت میں، اور اسلحہ نہ ہوتے ہوئے بھی چار ماہ تک بھیڑیوں کا غول جھوک شریف کے کمیون میں داخل نہ ہو سکا۔

انقلاب دشمن، مکارترین انسان

کسانوں کی اس حکمرانی کو پلک جھپک میں فرو کرنے کے لیے حکمران طبقے کے سارے اندازے تخمینے غلط ثابت ہوئے۔توپ وتفنگ سے لیس فوج کا جھوک کے فقیروں پر فتح پانے کا کوئی امکان نہ رہا ۔اپنے کمانڈر کی ہدایت کے عین مطابق کسان بغیر نعرہ بازی کیے، بغیر شور مچائے اور بغیر نظر آئے اپنی شبینہ چھاپہ مار کاروائیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنا دفاع اس قدر مضبوطی سے کر رہے تھے کہ کمزوری کا احتمال صفر تھا۔اُدھر اُن کا دشمن لڑائی کی طوالت سے جھنجھلا چکا تھا۔ درباری عیش وعشرت، فیوڈل کروفر اور دنیاوی لطف ولذت سے دُور ہر شب اپنی لاشوں زخمیوں کی مصیبت میں گڑ کر اُسے اب شکست کے آثار نظر آنے لگے تھے۔اُس کے خزانے خالی ہو رہے تھے، ان کی افواج میں پستی چھارہی تھی اور اُن میں مایوسی آ رہی تھی ۔اعظم خان نے تاجروں سے زبردستی پیسہ وصول کرنا شروع کر دیا۔جنگی ٹیکسوں کی بھرمار ہوئی۔اور ٹھٹھہ میں قیامت مچ گئی(20)۔

دشمن کی حکمتِ عملی تو وہی رہی البتہ داؤ پیچ بدلنے کا فیصلہ ہوا۔اب شیر نے گیدڑ بننے کا فیصلہ کیا۔تب سرکار کے دل میں موجود لومڑی آگے آئی۔آمنے سامنے کی جنگ میں شکست خوردہ شاہی

افواج نے اب کسانوں کے ارفع واعلیٰ عقائد کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کرلیا۔فیوڈل، میاں یار محمد نے اپنے طبقے کی خصلت کے عین مطابق دغا سے کام لیا اور یکم جنوری 1718ء کو شاہ عنایت کے سامنے صلح کی تجویز پیش کر دی۔طریقہ کی پستی تو دیکھئے: میاں خدایار خان کلہوڑا کے بیٹے محمد خان اور شہداد تالپر وغیرہ جو کہ سالارانِ فوج تھے، قرآن ہاتھوں میں لے کر جھوک کی طرف روانہ ہوئے۔(قرآن کی قدر و قیمت ملّا اور فیوڈل کے پاس کہاں ہوتی ہے؟ قرآن کی عظمت کا احساس تو کسان کے پاک دل میں ہوتا ہے کہ قران اس کا ایمان، قول، مردانگی، انسانیت وچن، عزت، ناموس سب کچھ ہوتا ہے۔)۔اور دشمن نے اب ''کسان کا قرآن'' ہاتھوں میں اٹھائے جھوک کی طرف مارچ کرنا شروع کر دیا۔اب تو اُس کے پاس ایٹم بم سے بھی بڑا ہتھیار آ گیا تھا۔وہ اِس قرآن کے واسطے دے کر اور اس کو ضامن جتلا کر شاہ عنایت سے ملنا چاہتے تھے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ جب قرآن روانہ ہوتا ہے تو عوام اُس کے لیے راستہ بناتے ہیں۔ قران آگے بڑھے تو عوامی صفیں احترام میں شق ہو جاتی ہیں۔ جب قرآن اٹھتا ہے تو لوگ اسے اٹھانے والے ہاتھوں کے عزائم نہیں دیکھتے، وہ اِن ہاتھوں کی غلاظت کو نہیں دیکھتے۔ وہ تو بس اُن ہاتھوں پہ موجود تقدس بھرا قرآن دیکھتے ہیں۔

چنانچہ یوٹوپیائی انقلابیوں میں سے، اِس عوامی دراڑ میں سے گزرتا ہوا قرآن خود کو اٹھائے رکھنے والے ہاتھوں کی مرضی کی رفتار سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ دشمن، اُس کی حفاظت میں کسان افواج کے بیچ میں سے بلاخطر آگے بڑھتے ہیں۔قرآن دیکھ کر جھوک کے پھاٹک خود بخود کھول دیے جاتے ہیں۔قرآن جنگ بازوں کے ہاتھوں پر سرِ عام امن کے قول دیتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے، کسی کو گزند نہ پہنچانے کی ضمانت دیتا ہوا قرآن بغیر کسی چون و چرا، بغیر کسی پوچھ گچھ اور بغیر کسی روک رکاوٹ کے شاہ عنایتؒ تک پہنچ جاتا ہے۔قرآن بلند ہوتا ہے عنایت کا سر تعظیم و رضا سے جھک جاتا ہے۔قرآن اِس یوٹوپیائی انقلابی کو اپنا واسطہ دے کر جنگ بندی کی درخواست کرتا ہے۔شاہ عنایت جواب میں ''جی اچھا'' کہہ کر جنگ بندی کا حکم دیتا ہے۔قرآن، شاہ کو مذاکرات کے لیے اپنے محفوظ

قلعے سے باہر نکل کر گورنر کے جنگی خیمے تک جانے کو کہتا ہے۔ انقلابی قرآن کی ضمانت کو لولا لاک کی ضمانت گردانتا ہے۔ (یہیں تو وہ دھوکا کھا گیا، یہیں تو اس جیسے بے شمار انقلابی دھوکہ کھاتے رہے)۔

یہ یکم جنوری 1717 کا دن ہے۔قرآن شاہ عنایت کی جان ہے، اس کے علم کا سرچشمہ ہے، اس کے عرفان کی سربلندی ہے۔قرآن انقلابی کا عشق ہے، عشق کی سربلندی ہے، عشق کی معراج ہے۔قرآن انقلابی کی آنکھ ہے، آنکھ کا نور ہے، ایمان ہے، راہ نما ہے۔قرآن نے ہی انقلابی کو ہتھیار اٹھانے کی بصیرت عطا کی تھی، آج وہی راہنما اُسے اپنا مضبوط اور ناقابلِ عبور مورچہ چھوڑنے کی درخواست کرنے خود چل کر آیا تھا۔شاہ عنایت ایک پالتو برّے کی طرح اپنے آقا کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جنگ، مورچہ، سپاہ، فتح، شکست، کمیون سب کچھ قرآن پر قربان۔

مگر، یہ قرآن بردار وحشی لوگ، انقلابی کو بڑے احترام کے ساتھ اُس کے دشمن کمانڈر نواب اعظم خان کے جنگی خیمے تک لاتے ہیں۔ اور جوں ہی انقلابی اس خیمے میں داخل ہوتا ہے تو گرفتار کرلیا جاتا ہے۔قرآن راہنما کے بجائے اچانک ہتھیار بنادیا گیا تھا۔ دشمن اس قرآن پرست کو صرف اپنے خیمے تک لانے کے لیے قرآن کو استعمال کر چکے تھے۔ اب قرآن اُن ہاتھوں سے اتر چکا تھا۔ ہاتھوں کی غلاظت پھر نظر آئی۔ اب اُن میں انقلابی کے لیے ہتھکڑیاں تھیں۔قرآن کو ہتھکڑی بنا دیا گیا تھا۔ انقلابی گرفتار ہو چکا تھا۔ اور مؤرخ کے لیے یہ لکھنے کے سوا کچھ نہ بچا کہ قرآن اس بڑی اور طویل جنگ کا فیصلہ کر چکا تھا۔

قرآن کی قسم تو صرف خدا ترس لوگوں کے لیے ہوتی ہے، راست باز انسانوں کے لیے ہوتی ہے۔ بے قول، بے مراد اور ابلیسی دل و دماغ کے لیے عہد، قول، قسم اور قرآن سب بے کار۔ اوپری طبقہ تو ''بے قرآن'' ہوتا ہے، اس کا تو نہ خدا ہوتا ہے، نہ قرآن۔ اسے صرف مال چاہیے ہوتا ہے۔ جائیداد ہی اُس کا خدا، اُس کا قرآن ہوتی ہے۔ اور تاریخ کے اندر معصوم کسانوں کاشتکاروں میں سے ہزاروں لاکھوں لوگ قرآن کی قسم پر اعتبار کر کے مذاکرات پر آمادہ ہوئے اور موت کی نیند سلا دیے گئے۔ مثالیں کیا دوں، کہ دل دھواں دھواں ہو جاتا ہے!!۔

مغربی تاریخ دان، یا پھر ایسے مورخین جنہیں عوام کے اندر قرآن کے تقدس کی سطح کے بارے میں معلومات نہ ہوں، یہ تنقید کر سکتے ہیں کہ شاہ عنایتؒ اس دھوکے میں آیا کیوں کہ جہاں ایک تاریخ ساز اور پوری انقلابی تحریک اُس کے اِس ایک اقدام سے شکست سے دوچار ہوئی؟۔

یہ تنقید ہماری بھی بن سکتی تھی۔ مگر میں یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں کہ شاہ عنایت کو دھوکہ ہوا ہوگا۔ ایسے بڑے جید عالم اور جہاندیدہ راہنما کو کون دھوکہ دے سکتا ہے، جسے بخوبی معلوم تھا کہ نزولِ قرآن سے لے کر اُس کے اپنے عہد تک قرآن شریف کو بہت بار بطورِ ہتھیار اس طرح استعمال کیا جا چکا تھا۔ منزلِ مراد کے ہزاروں مسافروں کو ساحل کے قریب پہنچ کر اِسی عظیم قرآن سے دھوکہ دیا جاتا رہا۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی تھی۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ شاہ دھوکہ کھاتا۔ کالی داس کے اس خیال سے ہمیشہ مسلح رہیے کہ ''جو عاشق اپنی محبوبہ کے دل کی دھڑکنوں کا اندازہ اپنے دل کی دھڑکنوں سے لگاتا ہے وہ حسین فریب کھاتا ہے''۔ اس لیے اِس واقعے کو سطحی طور پر نہ دیکھا جائے۔ شاہ کا یہ اقدام قطعاً دھوکہ کھانے کی وجہ نہ تھا بلکہ لگتا ہے کہ یہ باقاعدہ اُس کی حکمتِ عملی تھی۔

میں اُس کے اِس اقدام کا کوئی اور جواز دے سکوں یا نہیں مگر وثوق سے کہتا ہوں کہ مزدک کا یہ پیروکار مزدک کے ساتھ کیے گئے دھوکے سے خوب واقف تھا، یسوع مسیح کا یہ مرید حضرت یسوع کے ساتھ کیے گئے دھوکے سے خوب واقف تھا۔ میرا دل اُس کے اس اقدام کو حکمتِ عملی کے زمرے میں شمار کرنا چاہتا ہے۔ یہ حکمتِ عملی صحیح تھی یا غلط، اس پر البتہ بحث ہوسکتی ہے۔

اس بات کو بھی چھوڑیے کہ آیا شاہ عنایت کی کسان تحریک کی کامیابی کے امکانات موجود تھے؟ اور اگر موجود تھے تو اُس کی شکل کیا ہونی تھی۔ آپ بس یہ دلچسپ بات (میری طرح کمزور عقیدہ بنے بغیر) دیکھیے کہ اس واقعے کے بعد ان تین صدیوں میں پھر کبھی آپ کو سندھ کی سیاست میں کلہوڑا، ، تالپور یا مغل نظر آئے؟ کبھی آپ نے اُن مفتیانِ ٹھٹھہ کے بارے میں کچھ سنا جن کے فتوے حکمرانوں کے ساتھ تھے۔ کبھی آپ نے اُن پیروں کے بارے میں کچھ سنا جنھوں نے کسان

تحریک کے خلاف کام کیا تھا؟ جب کہ فکرِ شاہ عنایت کی بڑھوتری آپ کو روس سے لے کر چلّی تک اور مشرقی جرمنی سے لے کر مغربی بنگال تک نظر آئے گی۔ شخصی کامیابی ناکامی کا تو تصور ہی ہیچ بات ہے، بس انسانی کارواں کو ناکام نہیں ہونا چاہیے۔ جھوک تحریک کا فلسفہ سر بلند ہونا چاہیے۔ اور بقول شاہ لطیف ''یہی عزمِ کوہ پیمائی حضرت اِنسان کو اپنی انسانیت کی اعلیٰ منزل یعنی پیارے پنہوں سے ضرور ملائے گا''۔

قرآن عوامی حساسیت کا مرکز ہے۔ عوام الناس کے اجتماعی وقار (قرآن) کو بے عزت کرنے والوں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ اور یہ فسطائی جھوٹ ہے کہ ''سب کچھ جائز ہے جنگ اور محبت میں''، نہیں۔ صرف جائز، جائز ہوتا ہے، ''سب کچھ'' جائز نہیں ہوتا، جنگ ہو یا امن۔ ہر جگہ فیئر پلے کی ضرورت ہوتی ہے، خواہ حالات کچھ بھی ہوں۔

اور ہاں............ یہ بات بھی گرہ میں باندھنے کی ہے کہ اگر جھوک کا کارواں جاری وساری ہے تو دشمن کی طرف سے پیرویِ جت وتالپر و پلیجو بھی جاری ہے۔ ہر عہد کی اپنی عیاری ہوتی ہے ۔ اور یہ عیاری کاروانِ جھوک سے برتی جائے گی۔ اور ہم سے ایک بڑی عیاری یہ کی جا رہی ہے کہ معرکہِ جھوک کو ہماری نئی نسل سے چھپایا جا رہا ہے۔

کبھی طبقاتی دشمنی کو چھوٹا، ایماندار، بہادر اور جنگی اصولوں کا پابند نہ سمجھئے۔ بالائی طبقہ سے مہذب ہونے کی، قول کی پاسداری کرنے کی، یا سماج میں موجود کسی بھی عالم گیر اچھی انسانی قدر اور رواج کی پابندی کرنے کی توقع کرنا عظیم ترین حماقت ہے۔ ظالم طبقہ کے ہاں کوئی جنیوا کنونشن، کوئی بنیادی انسانی حقوق اور کوئی بین الاقوامی چارٹر وغیرہ نہیں ہوتے۔ یہ سب اُس کے کھڑے کردہ ''آسرے'' ہیں۔ یہ سب اُس کے اصل کرتوت کو چھپانے کے پردے ہیں۔

لہٰذا، اب شاہ عنایتؒ جنگی قیدی تھے۔ سب سے بڑا انسان سب سے چھوٹے لوگوں کی حراست میں تھا۔ اُن لوگوں کی حراست میں، جن پر کسی انسانی اور اخلاقی قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ بے قران، بے رواج، بے قانون لوگ............۔

زندگی امتحان لیتی ہے

گرفتار شاہ عنایتؒ کو ٹھٹھہ لے جایا گیا۔ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے نواب اعظم خان اور شاہ عنایت کے بیچ ہونے والے سوال جواب کو نقل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک عالم، ایک جاہل حاکم کے روبرو تھا۔ لہٰذا اس کے جوابات حافظ شیرازی کے اشعار، قرآنی آیتوں اور حدیثوں کے علاوہ کچھ نہ ہوں گے۔ میں اس شخص کے علم سے منوری، ادب سے اس قدر شناسائی اور اوسان کی آخر تک بحالی پہ حیران ہوتا ہوں۔ اس کا ادبی ذوق اور برمحل استعمال تعجب میں ڈالتا ہے۔ مثلاً جب اُن سے پوچھا گیا کہ ''تم نے یہ شورش کیوں برپا کی؟''

تو شاہ نے اس رباعی کو اپنا جواب بنایا:

آن روز کہ توسنِ فلک رازین کردند
آرائش مشتری زپروین کردند
ایں بود نصیبِ مازدیوانِ قضا
ماراچہ گناہ، قسمتِ ما ایں کردند

ترجمہ:

جس روز فلک کے گھوڑے پر زین رکھ دی گئی

پروین سے مشتری کی آرائش کی گئی

(اُسی روز) قضا کے دفتر سے یہ ہمارا نصیب ہو گیا

ہمارا کیا گناہ ہماری قسمت اس طرح لکھی گئی

حکمران کبھی بھی درباری مسخرے، درباری پیر، اور درباری شاعر کے بغیر دربار میں نہیں بیٹھتا۔ اُس وقت بھی اُس کا درباری اور مصاحب شاعر، رضا وہاں موجود تھا۔ اِس خان کے نوکر ڈیڑھ خان نے آسمان پر تھوکا، اس نے شاہ عنایت کو تنبیہ کی:

دوست بیدار بشو، عالم خواب است اینجا

حرفِ بیهوده مگو، پای حساب است اینجا

ترجمہ:

دوست، جاگ جاؤ یہ عالم خواب ہے

بیہودہ حرف نہ کہنا، یہاں حساب کا موقع ہے

پاگل، کس کو تنبیہ کر رہا ہے۔ شاہ عنایتؒ اُسے کیا جواب دیتا کہ اُس کے تو دل پر غلامی کے مہر لگے ہوئے تھے، اس کے کانوں، آنکھوں پر بندگی اور چاپلوسی کے مہر لگے ہوئے تھے۔

شاہ نے فی البدیہہ یوں کہا:

درِ کوئے نیك نامی مارا گزر نه دادند

گر تو نمی پسندی، تغیر کن قضا را

ترجمہ:

نیک نامی کے کوچے میں انہوں نے ہمارے لیے گزر ہی نہ لکھا

اگر تمہیں پسند نہیں تو تقدیر بدل ڈال

اور تقدیر تو اُس کا بڑا بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ جبر و اختیار والے قانون سے صرف باضمیر لوگ ہی کھیل سکتے ہیں۔ معروض کی غلامی کو انقلابیوں کی جماعت پچھاڑ سکتی ہے۔ حیرت ہے کہ لاؤڈ سپیکر والے کے ہاں ظلم و ناانصافی تقدیر (معروض) ہے مگر اُس ظلم و ناانصافی سے ٹکرا جانا تقدیر (معروض) کیوں نہیں۔ نواب کے دربستہ کلونز کلونز کرنے والے کتے کو یہی جوتا کافی تھا۔ جنھوں نے اپنی دانش (خواہ کسی بھی قیمت پہ) بیچ ڈالی ہو، انہیں شرمناک بات کہہ کر شرمناک چُپ لگ جاتی ہے۔

چنانچہ اب نواب خود بول پڑا:

آمادهِ بلا باش

(اب سزا کے لیے تیار ہو جاؤ)

اب اُسے کوئی کیا بتائے کہ ہمہ وقت اپنا سر ہتھیلی پہ رکھا ہوا، انقلابی انقلاب جیسی بلا کا داعی ہو، اُسے کسی اور بلا سے کیا ڈرانا؟۔ جس کی تعلیم ہی ''کردہ و ناکردہ اقدام کی سزا بھگتنے کے لیے تیاری'' کے شعبے میں کر دی گئی ہو، تو اسے ''سزا کے لیے تیار رہنے'' کی دھمکی دینے کا تکلف کیوں کر کیا جا رہا ہے؟۔ حکمران کے سامنے کیا بین بجانا۔ شاہ عنایتؒ نے ایک ہی مختصر فقرے سے اس کے کبر و غرور کا محل چکنا چور کر دیا:

البلاءِ للولاءِ کا اللهب للذهب

دوستی کے لیے آزمائشیں اس طرح ہیں جس طرح کہ سونے کے لیے آگ۔

آگ تو سونے کو مزید چمکا دیتی ہے!!۔

حکمران کی سمجھ میں اب بھی نہ آیا کہ وہ کس جارجی دیمتروف سے مخاطب ہے، کس ''History Will Absolve Me'' والے سے اُس کا پالا پڑا ہے(*)۔ اپنے ضمیر کی رسوائی جاری رکھنے پر مُصر حاکم، پھر ایک احمقانہ سوال کرتا ہے:

خود کو بدنام کر کے مصیبت کے تیر کا نشانہ کیوں بنایا؟

جواب آیا:

عاشق چه کند گر نه کشد بارِ ملامت

با هیچ دلاور سپرِ تیرِ قضا نیست

ترجمہ:

عاشق کیا کرے اگر بارِ ملامت نہ جھیلے تو

کوئی سورما تقدیر کے تیر کو ڈھال سے نہیں روک سکتا

ارے بابا، انقلابی کب خود کچھ کر رہا تھا۔ وہ تو نور کے کہنے پر زمین سے تاریکیاں واپس آسمان میں واپس بکھیر رہا تھا۔ وہ تو ''گویائی کے مالک'' کے الفاظ بول رہا تھا، وہ تو عصر کی رفتار پہ، قادر کی منشا پہ لیفٹ رائٹ کر رہا تھا، وہ تو اسباب وعلل کے قانون کی وکالت کر رہا تھا، وہ تو جمہور کے لکھے پر عمل کر رہا تھا۔

نواب نے کہا:

اس وقت جبکہ تم قتل ہو رہے ہو، پھر بھی ضد نہیں چھوڑتے؟

تو انقلابیوں کے سردار نے فرمایا:

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق

ثبت است بر جریدهِ عالم دوامِ ما

ترجمہ:

(وہ شخص کبھی بھی نہیں مرسکتا جس کا دل عشق سے زندہ ہے

ہماری ہیشگی دنیا کے صفحے پر لکھی ہوئی ہے

اب، اے اہل نطق وعلم! کانپ جاؤ غصے سے کہ حاکم الفاظ کا غلط ترین استعمال کر رہا تھا:

''قتل ہو رہے ہو!''

حق وانصاف کا ایک بھی مقتول بتایئے جو مر گیا ہو۔ موت صرف جانوروں کی ہوتی ہے۔ جس نے دنیا میں آکر سوائے کھانے پینے اور سونے کے کچھ نہ کیا ہو، موت اُسے آتی ہے۔ شاہ عنایتؒ

کے لیے ''قتل ہو رہے ہو'' والا لفظ ہی اس کی شان میں گستاخی کرنے کے مترادف ہے۔ شاہ عنایت جیسے خلقِ خدا پہ عاشق لوگ قتل نہیں ہوتے، مرتے نہیں، دوام پاتے ہیں، اور وجود وہستی کے آسمان کے صفحے پر دوام پاتے ہیں، زمان اور مکان کے حدود وقیود سے اُس پار دوام پاتے ہیں۔ تین سو سال بعد بھی اِن سطروں کے لکھاری اور قاری کے دلوں میں حیات پاتے ہیں۔

اب حاکم ایک اور طفلی سوال پوچھتا ہے:

''اولوالامر'' (وقت کے حاکم) کے حکم سے تم نے منہ کیوں موڑا؟''

ہونہہ، ہر غاصب کو ''اولا امر'' ہونے کا دعویٰ ہوتا ہے۔ اِن کے تو حلیے ریچھ و بندر میں بدل جانے چاہئیں۔ دیکھیے، ہمارے آپ کے لیڈر نے کیا جواب دیا:

ما مریداں روبه سوئے کعبه چوں آریم چوں

روبه سوئے خانهِ خمّار دارد پیرِ ما

ترجمہ:

ہم مرید کعبے کی طرف رخ کیسے کریں

جبکہ ہمارے مرشد کا رخ ساقی کے گھر کی طرف ہے

اب ڈنڈے نے اپنی اصلیت دکھائی۔ دلیل و ڈنڈے میں سے صرف ایک نے زندہ رہنا ہوتا ہے۔ دونوں بہ یک وقت قائم نہیں رہ سکتے۔ ڈنڈے کی سانس، دلیل گھٹا رہی تھی۔ سو ڈنڈے (نواب) نے پوچھا:

''بتاؤ اب کیا خواہش ہے؟''۔

انقلابی تو خواہشوں، لالچوں اور حاجتوں سے بہت بالا ہوتے ہیں۔ چنانچہ شہیدِ عشق نے یوں جواب دیا:

من از آن دم که وضو ساختم از چشمهِ عشق

چار تکبیر زدم یکسر بر هرچه که هست

ترجمہ:

میں نے جس وقت عشق کے چشمے سے وضو کیا تھا

اُس وقت ہر موجود چیز پر جنازے کی چاروں تکبیریں پڑھی تھیں

یوٹوپیا دھوکہ کھا چکا تھا، جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ حاکم طبقہ دائمی بادشاہی چاہتا ہے، سو مل گئی۔ چنانچہ اب اس کو عارضی فتح ملنے کے بجائے دائمی بقا یقینی ہو چکی تھی۔ وصال فانی ہے............ اور فطرت اپنے پسندیدہ لوگوں کو فانی کبھی رہنے نہیں دیتی۔ فراق ہی کو ثبات ہے۔ چنانچہ شاہ عنایتؒ کو فراق ہی ملنا تھا، انقلاب سے فراق......اور یہ فراق بھی عجب فراق تھا۔ محبوبہ کی دہلیز پر پہنچ کر عاشق کو دید سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جس وقت شاہ عنایت کو جیل میں بند کیا جا رہا تھا تو وہ یہ شعر پڑھ رہا تھا:

ساقیا برخیز در دہ جام را

خاک برسر کن غمِ ایام را

ترجمہ:

اے ساقی اٹھ جام بھر کے دے

غمِ ایام کے سر پہ مٹی ڈال

(21)

مگر اب بھی انت کہاں؟ اس انقلابی کو اب ایک اور امتحان میں ڈالنے کا فیصلہ ہوا۔ ظلم ''وُسعہا'' سے بھی آگے بڑھا۔ اور یہ امتحان شاید سب سے مشکل امتحان تھا۔ شاہ کو مسلح دستے کے پہرے میں میدان میں لایا گیا جہاں گورنر اعظم خان، یار محمد کلہوڑا، ملتان کا شہزادہ، اور میر شہداد خان ٹالپر پہلے سے موجود تھے۔ گورنر نے حکم دیا کہ شاہ عنایتؒ کو قتل کرنے سے پہلے اُس کے بھائی میاں رحمت اللہ اور اُس کے نوجوان بیٹے محمد یوسف کو لا کر شاہ عنایت کے سامنے قتل کیا جائے۔

اس کے حکم کی بجا آوری کرتے ہوئے مسلح سپاہیوں نے شاہ عنایتؒ کے بھائی اور بھتیجے کو میدان کے بیچ لا کر کھڑا کر دیا۔ (ہمارے یاروں نے انقلاب کو اِی میلوں کی گپ شپ سمجھ رکھا ہے!)

کیا مشکل صورت حال ہے۔ کیا روح کُش امتحان ہے۔ مگر انقلابی کا دل ہے کہ کمزور ہوتا ہی نہیں، نچلے طبقے کا ساتھی ہے کہ لڑکھڑاتا ہی نہیں۔ یہ سب لوگ اجتماعی زراعت کے نظریے سے لیس لوگ تھے۔ انہیں تو سبق ہی یہی دیا گیا تھا کہ:

اگر تم بھی ہو پروانوں میں شامل

تو شعلے دیکھ کر واپس نہ آؤ

جلتی آگ اُس محبوب کی ہے

جھجکتے کیوں ہو فوراً کود جاؤ

سوشلزم کے نظریے سے کندن بنے یہ لوگ نہ صرف اپنا اپنا امتحان دے رہے تھے بلکہ وہ تو اجتماع کا، جمع کا، پورے کمیون کا امتحان دے رہے تھے۔ شاہ عنایتؒ کو اپنے سامنے اپنے پیاروں کو قتل کیے جانے کا جبری نظارہ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اسے دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا: اجتماعی انسانیت کی فلاح کے نظریے کا، یا اپنے بھائی بھتیجے کی جان کا۔ شاہ نے حسبِ توقع اپنے انسان دوست نظریے کو پیارا جانا۔ اُس سے قبل مولانا روم یہی تو کہہ گیا تھا، ''صرف میٹھی آواز والے پرندوں کو قید کیا جاتا ہے۔ کیا تم نے الوؤں کو کبھی پنجروں میں رکھے دیکھا ہے؟'' اب رومی نہیں، شاہ عنایت تھا۔ اس نے اپنے بھائی اور بھتیجے کو مخاطب کر کے کہا:

در مسلخ عشق جز نکورا نہ کُشند

لاغر صفتان درشت خو را نہ کُشند

گر عاشقِ صادقی ز کُشتن مہ گریز

مُردار بود ہر آنکہ، او را نہ کُشند

ترجمہ:

عشاق کی قتل گاہ میں موٹی اور فربہ بھیڑ ہی ذبح ہوتی ہے

لاغر اور بدمزاج ذبح نہیں ہوتے

اگر تم سچے عاشق ہو تو قتل سے نہ ڈرو

بھیڑ مردار ہو جاتی ہے، اگر اُسے ذبح نہ کریں

دل، حوصلہ، بہادری ایسے لوگوں سے بھیک لینی چاہیے۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ نماز میں مصروف ہو جاؤ۔ وہ دونوں نماز میں مشغول ہوئے۔ شاہ کے سامنے جلاد نے اس کے بھائی اور بھتیجے کے سر تن سے جدا کر دیے۔ لاشیں کچھ لمحے تڑپیں اور پھر خاموش ہو گئیں۔ کوہِ طور ہوتا تو ایک بار پھر بھسم ہو جاتا۔ مگر شاہ عنایت اپنے بھائی اور بھتیجے کے خون سے لت پت دھڑوں اور سروں کو تڑپتا دیکھتا رہا اور کہتا رہا:

میکُشد ایں غم کہ می گوید، تو بہ کردی زعشقِ ما نہ ہنوز

بہ ادائی نماز شو باللہ، عالمے توبہ کرد مانہ ہنوز

ترجمہ:

یہ دکھ مجھے مار دیتا ہے یہ کہہ کر، کہ ابھی تک عشق سے توبہ کی یا نہیں؟

خدا کی قسم! ساری دنیا توبہ کر سکتی ہے، میں ایسا نہیں کروں گا (22)

توبہ کرنے، معافیاں مانگنے والوں کو اِس ماں نے تو جنا ہی نہ تھا جس کا ایک بیٹا اور ایک پوتا ذبح کر دیے گئے اور دوسرا بیٹا قیدی بنے، یہ سب کچھ دیکھنے پہ مجبور تھا۔ یہ نوروز خان نہ بے ہوش ہوا، نہ اسے ڈرپ لگانے کی حاجت ہوئی۔ استقامت، استقامت، استقامت............

عشق جوشد بحر را مانندِ دیگ

عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ

عشق بشگافد فلك را صد شگاف

عشق لرزاند زمیں را از گزاف

ترجمہ:

عشق سمندر کو دیگ کی مانند اُبال ڈالتا ہے

عشق پہاڑ کو ریت کی طرح پیس ڈالتا ہے

عشق آسمان میں سو سو شگافیں ڈالتا ہے

عشق زمین کو اپنی للکار سے لرزا دیتا ہے

اور عشق نے بنگویں براث اور تنگویں براز اتک کا بلیدان مانگا تھا، عنایت نے "حاضر جناب" کہہ دیا۔ مگر اب تک کہاں؟ ابھی کچھ اور سننا باقی ہے، ابھی کچھ اور پڑھنا باقی ہے، کچھ اور لکھنا باقی ہے۔ شہیدوں کی سرگزشت مختصر کب ہوتی ہے۔ ان پہ امتحان کم اور نرم کب ہوتے ہیں۔ ایک ایک موڑ عبرتناک، ایک ایک منظر سبق آموز۔ چنانچہ ردِ انقلاب نے بلا کسی ضرورت اور مجبوری کے درباری مولویوں مفتیوں کو بلایا، عدالت لگی اور اِس کُنگرو کورٹ نے فتویٰ دیا کہ شاہؒ کو سزائے موت ہو۔ (23)

دریا،سمندر میں جا گرتا ہے

7 جنوری1718 کو'' قرآنیوں'' نے 63 سالہ شاہ عنایت کا سرقلم کر دیا۔(24)۔(بلوچی میں،قرآن پہ لی ہوئی قسم توڑنے والوں کو'' قرآنی'' کہتے ہیں۔ یہ بدعہدی کی گویا انتہا ہوتی ہے۔اس لفظ سے زیادہ مکروہ لفظ بلوچی زبان میں شاید ہی ہو!!)۔

کہتے ہیں کہ جس وقت عشاق کے اس امام پر جلاد نے وار کیا تو اس کے ہاتھ میں وہی تلوار تھی جو شاہ عنایت کو اس کے استاد و مرشد سید عبدالمالک نے وقتِ رخصت دی تھی۔شاہ ہمیشہ یہ تلوار اپنے ساتھ رکھتا تھا۔مگر جب اسے دھوکے سے قید کیا گیا تب یہ تلوار بھی اُس سے چھین لی گئی تھی۔ آپ کو تو یاد ہوگا کہ شاہ شہید نے خود اپنے مرشد سے یہ تلوار مانگی تھی۔اور مرشد نے تلوار اسے دیتے ہوئے پوچھا تھا کہ اس تحفے کی قیمت کیا ہوگی؟ تو شاہ نے گردن جھکائی تھی اور کہا تھا:'' سائیں،اس کی قیمت گردن ہے''۔

اپنی مقدس گردن پہ اپنے مرشد کی تحفے میں دی ہوئی یہی تلوار چلنے سے ذرا قبل آپ نے جلاد کو رکنے کا کہا،اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا،کچھ اشرفیاں نکالیں اور جلاد کو دیتے ہوئے کہا۔'' یہ ہوا

تمہاری محنت کا پیشگی معاوضہ''۔

دیکھتے کیا ہو خنجر مارو اپنا ہاتھ اٹھاؤ
گھائل کر دو، جان بھی لے لو، میری آن بڑھاؤ

شہادت کے وقت شاہ عنایتؒ کی مبارک زبان پہ حافظؔ کا یہ شعر تھا:

رہا نیدی مرا از قیدِ ہستی
جزاك اللہ فی الدارین خیرا

ترجمہ:

تم نے مجھے زندگی کی قید سے رہا کر دیا
اللہ تمہیں دونوں جہانوں میں جزا دے

اسی طرح انہوں نے اس موقعے پر بیدلؔ کا یہ شعر بھی بلند آواز میں کہا تھا:

سر درِ قدمِ یار فدا شد چہ بجا شد
ایں بارِ گراں بود ادا شد چہ بجا شد

یار! بہادری کی کوئی انتہا بھی ہے؟ موت کے نام سے کانپ کانپ کر زندگیاں گزاری جاتی ہیں اور یہ صاحب تلوار زن کو پیشگی معاوضہ دے رہا ہے۔موت اور ملک الموت کی وحشت ذرا اُدھر بھی جاتی ناں! حمید بلوچ شہید پھانسی چڑھتے ہوئے بلوچ اور بلوچستان زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔ جب تھامس مور کولٹا کر اُس کی گردن اڑائی جا رہی تھی تو یک دم اُس نے اپنی داڑھی ایک طرف کرتے ہوئے کہا تھا:'' گردن اڑا دو، میری داڑھی نے تو کوئی گناہ نہیں کیا تھا''۔موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اِسی کو کہتے ہیں۔دل ہیں یا کوہِ با بنور کے پتھر! مکمل ہوش و ہواس میں، تمکنت کے ساتھ، شان کے ساتھ، وقار کے ساتھ دشمنِ جاں سے بغلگیر ہو جانا، قتل گاہ میں یہ دیوانگی، یہ بہادری............ بھلا گہری کمٹمنٹ بِنا ممکن ہے؟!!

شاہ عنایتؒ کی شہادت کی خبر جب ٹھٹھہ سے انقلاب کے ہیڈ کوارٹر جھوک پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا۔ ایک مقبولِ عام لیڈر قتل کر دیا گیا تھا۔ انقلاب کا راہنما، روحانی پیشوا، اور علم و ادب کا فروزاں چراغ گُل کر دیا گیا تھا۔ خلقِ خدا اپنے محسن کو کبھی فراموش نہیں کرتی۔ اور شاہ عنایت جیسے کامریڈ اِن آرمز کو تو بالکل نہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ عمومی طریقہ نہیں اپنایا گیا۔ اس کے ساتھ تو قرآن پہ کی گئی عہد شکنی کی گئی تھی۔ اسے تو وہ بالکل بھی درگزر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جھوک مکمل قہر بن چکا تھا، پوری آبادی غضب ناک ہو گئی۔

انقلاب کی مئے ایک بار جب لبوں پہ لگ جائے تو پھر ذرا سی پیاس بھی تڑپا دیتی ہے۔ ان لوگوں نے تو انقلاب کی بالٹیاں پی رکھی تھیں۔ اب مچھلی بن پانی کے کیا جیے گی ساری آبادی کو زندگی انقلاب بِنا کھوکھلی لگی، سب نے جاں وار دینے ٹھان لی۔ جو کچھ ہاتھ آیا دشمن پہ آخری وار کے لیے استعمال کیا گیا۔ لاٹھی، بھالا، گدال کلہاڑی پتھر............

دشمن جان گیا کہ اُسے آخری زندہ کمیونسٹ سے بھی لڑنا پڑے گا۔ چنانچہ اس نے شہر کو آگ لگا دی۔ (ہلاکوؤں کی تعداد تاریخ میں لاتعداد رہی ہے!)۔ اس نے توپوں بندوقوں تلواروں کے استعمال کو جنس و عمر کی تفریق سے آزاد کر دیا۔ تاریخ ایسی وحشیانہ موتِ عام کی مثال نہ دے پائے گی۔ قصائی آزاد ہو چکا تھا، اپنی پوری باسامانی کے ساتھ فرعون بپھر چکا تھا۔ خون، انسانی خون، محنت کش کا خون، کمیون کا خون، صبح نو کے پیامبروں کا خون، اجتماعی کاشتکاری کا خون، فیض و برکت و خیر کا خون............ شاہی انتقام کی آگ جھوک کا رخ کر چکی تھی۔ فقیروں کا قتلِ عام شروع ہوا۔ اُن کے گھر جلا دیے گئے۔ انکے اثاثے لوٹ لیے گئے اور بستی کی چہار دیواری مسمار کر دی گئی۔ جھوک کی اجتماعی کھیتی سیلابِ خون میں ڈوب گئی۔ نہ بیج بونے والے بچے، نہ فصل کاٹنے والے............

کہا جاتا ہے کہ اتنے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے کہ کئی دنوں تک انہیں دفنایا جاتا رہا اور سات بڑے کنوئیں کھود کر سب شہیدوں کو ڈال کر انہیں مٹی سے بھر دیا گیا۔ عوام الناس میں آج تک ان اجتماعی قبروں کو کس تکریم سے پکارا جاتا ہے: ''گنجِ شہیداں''۔

میں اِن گنجِ شہیداں کے آستانوں پر گیا۔ اپنے لیے کچھ نہ مانگا، کہ برا لگتا ہے۔ بس، اُن کے نظریے کی سچائی کی گواہی دیتا رہا۔ زور زور سے!!۔ مجھے معلوم ہے کہ شہید صرف یہی چاہتا ہے کہ تین سو سال بعد بھی اُن کا کوئی پیرو کار سلام کے لیے آئے تو اُن کے کاز کی سچائی، اُن کے نظریے کے برحق ہونے، اور اُن کی قربانی کے جائز ہونے کی گواہی دے۔

جھوک میں لڑی جانے والی اس پہلی منظّم طبقاتی جنگ میں بے شمار ہندو محنت کشوں نے بھی حصہ لیا اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ آج تک بے شمار ہندو مرید شاہ عنایتؒ کی درگاہ کے خدمت گار ہیں۔

روضے کے احاطے میں آپ کو بے شمار قبریں ملیں گی جو کچی ہیں اور اُن پر قرآنی آیات لکھی کپڑے کی چادریں بچھی ملیں گی۔ کسی پر سرخ چادر ہے، کسی پر سبز اور کسی پہ سیاہ۔ کسی پہ ''والناس'' کی سورت لکھی ہے تو کسی پہ سورہ فاتحہ۔ اور جب سرہانے پر کتبے پڑھنے لگا تو حیرت کے گویا سمندر میں ڈوب گیا۔ ارے ان میں سے تو بہت ساری قبریں ہندو شہیدوں کی ہیں۔ دو باتوں پہ حیرت ہوئی؛ ایک تو انہیں جلانے کی بجائے دفن کیا گیا اور دوسرا اس بات پہ کہ ان پر قرانی آیتیں سورتیں لکھی چادریں چڑھی ہوئی تھیں............ جدوجہد تو نسل قوم مذہب رنگ سب فرق مٹا دیتی ہے۔ حق پرست، عقیدے کی تفریق کے بجائے انسانیت کی یک مُشتی و یک جہتی کے علمبردار ہوتے ہیں۔ اور یہی بات تو جھوک کی تباہی (یا ابدی آبادی) کا باعث بنی تھی۔ اسی بات کو تعصب کی دیمک کے چاٹے ذہنوں نے قبول نہ کیا تھا۔ اسی بات پہ تو ملاّ، پیر، قاضی، فیوڈل اور بادشاہ اکٹھے ہو گئے تھے اور اس نظریہ کے ہیڈ کوارٹر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔

اس عظیم جدوجہد کا منشور جی ایم سید نے یوں اخذ کیا:

''* شاہ عنایت کا پیغام اُس وقت اورنگزیبی طرز سے پیدا شدہ مذہبی کٹڑپن اور مذہبی تعصب کی جڑیں اکھاڑ رہا تھا جس کے اندر ملاّ، پیر اور حاکم کا مستقل مفاد موجود تھا۔

* اس انقلابی کے ہاں مذہبی عقیدہ بندہ اور خدا کے بیچ شخصی معاملہ تھا۔اس میں ملاّ کو دست اندازی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ بات تو مذہب اور سیاست کو علیحدہ کرتی تھی۔اور یہیں تو ملاّ اور حاکم کی موت تھی۔

* شاہ عنایت نے ملاّ کے نقطہِ نگاہ والے مسلمانوں کو جدا قوم تسلیم نہیں کیا۔اسے غلط،اور فرسودہ سمجھا۔اس کے ہاں ہر صالح انسان کسی مذہبی امتیاز کے بغیر مومن تھا اور غیر صالح شخص بے راہ تھا۔اسی بات میں تو آزاد فکری، انسان دوستی، محبت، وحدت الوجود اور وحدتِ مذاہب کا راز پوشیدہ تھا۔اسی اصول میں تو نفرت، نفاق، دوئی اور تعصب کی موت تھی''(25)۔

مگر اس کے منشور کا سب سے اہم حصہ اُس کا بسایا ہوا وہ کمیون (دائرہ) تھا جہاں ہر شخص اپنی اہلیت کے مطابق کام کرتا تھا اور اپنی ضرورت کے مطابق معاوضہ پاتا تھا، جہاں کوئی شخص بھوکا نہیں رہتا تھا۔دائرہ سب کا خیال رکھتا تھا۔ بیمار، کم سن، بوڑھوں کی فلاح کی ضمانت دیتا تھا۔

شاہ عنایتؒ کو اپنے نظریات سے پیار تھا۔اسے دشمن کی طبعی و جنگی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا۔شکست و فتح سے بے نیاز انقلابی نے سب سے پہلے اپنے فلسفے اور برحق نظریہ کی تبلیغ کے انتظامات کر دیے۔اس نے جنگ شروع ہونے سے بھی قبل یہ خیال رکھا تھا کہ سب انقلابی جھوک میں ہی جمع نہ ہوں۔اس نے کوئی ضلع کوئی گاؤں خالی نہ چھوڑا۔ سپاہِ انقلاب کی شدید ضرورت کے باوجود کمانڈر نے اپنا نظریاتی محاذ کمزور نہ کیا۔اس نے چُن چُن کر دانشوروں اور نظریہ دانوں کو میدانِ جنگ سے کوسوں دور اپنے اپنے علاقوں میں بھیج دیا تھا تاکہ جنگ کا خواہ کوئی نتیجہ نکلے،نظریے کا مورچہ خالی نہ ہو۔کمیون کا فلسفہ لوگوں تک پہنچتا رہے۔''الارض اللہ'' کی بلند آواز مدھم نہ ہونے پائے،''جیکو کھیڑے سو کھائے'' والا فلسفہ منور ہی رہے۔

ابھی بھی کہتے ہیں کہ سندھ میں ایک پورا علاقہ شاہ عنایتؒ کے فقیروں اور کامریڈوں پر مشتمل ہے مگر تین سو برس گزرنے کے باوجود یہ لوگ آج بھی اُن کی زیارت گاہ نہیں آتے۔ پوچھنے پر بتاتے ہیں:

''مرشد نے جھوک آنے سے منع کیا تھا''۔

ممکن ہے سندھ کی کسان تحریک نے ایسے لوگوں کا کھوج لگالیا ہو۔اور اُن کے ساتھ جڑ گئے ہوں۔مگر میری معلومات اس بارے میں ناقص ہیں۔میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ سندھ کی کسان تحریک شاہ عنایت اور جھوک جنگ سے واقف بھی ہے کہ نہیں۔

طبقاتی جنگ جیسی خونی جنگ نہیں ہوسکتی۔جھوک کو تباہ کرنے پر ہی قناعت نہ کی گئی بلکہ اس تحریک کی ساری باقیات کو برباد کرنا تھا۔حکمرانوں نے جھوک تو تباہ کر دیا مگر اُن کے لیے گاؤں گاؤں بکھرے اِن نظریاتی لوگوں کی تباہی تو بہت مشکل تھی۔ چنانچہ منادی کرادی گئی کہ جو کوئی بھی کسی صوفی کا سر کاٹ کر لائے گا اسے پانچ روپے انعام دیے جائیں گے۔ ....مگر کب تک؟ مگر کتنے؟ آفاقی نظریات اِس طرح تو پکڑائی نہیں دیتے!! چنانچہ بات نہ بنی تو اعلان ہوا جو کوئی بھی زرد لباس (فقیروں کی وردی) میں نظر آئے قتل کر دیا جائے۔کتنے مارے گئے، کتنے انعام یافتہ بنے معلوم نہیں ۔مگر اتنا معلوم ہے کہ عصروزمانے کا مالک ارضی حکمرانوں پہ ہنستا ہی رہا۔

پھر حکم ہوا کہ جس شخص کی آنکھیں سرخ ہوں اسے چوٹ ماری جائے۔اگر وہ ''اللہ'' بولے تو سمجھو 'جھوکی' ہے، ماردو۔سر لاؤ اور انعام کا پیسہ وصول کرو۔

برسوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ملک الموت کی متحرک و متوحش کارگزاری رجسٹر میں سما ہی نہیں پارہی تھی۔اور جھوک میں گندم و جوار کی کاشت اب رک چکی تھی۔اب تو کسان اپنی بیٹیوں بھائیوں کو کاشت کررہے تھے۔جگر کے ٹکڑوں کو اجتماعی قبروں میں کاشت کررہے تھے۔ یہ قتل و قتال کہیں جاکر اُس وقت ختم کیا گیا جب دہلی پر محمد شاہ نے بادشاہت سنبھالی(26)۔

چہ بجا شد............

شاہ عنایت کی اس پوری جدوجہد کو تین حوالوں سے دیکھا جا سکتا ہے:

1- وہ انسانیت دوست، فرقہ بندی سے پاک اور امن وآشتی کا علمبردار تھا۔

2- اس نے مغلوں کی بالادستی کے خلاف جدوجہد کی جسے آج کی ترقی یافتہ اصطلاح میں ''قومی'' جدوجہد کہتے ہیں۔

3- جاگیرداری نظام کے خلاف، اور مشترکہ ملکیت کے لیے جدوجہد کی، جسے آج کی ترقی یافتہ اصطلاح میں ''جمہوری'' جدوجہد کہتے ہیں۔

لہٰذا شاہ عنایتؒ کی جھوک تحریک ایک قومی جمہوری تحریک تھی۔مگر سادہ زمانے میں اصطلاحات تعداد میں کم ہوا کرتی ہیں۔اور معنوں میں وسیع اور دھندلی بھی۔شاہ کی جھوک جنگ ایک ایسی قومی جمہوری تحریک تھی جو متشدد بھی تھی۔آئیڈیلسٹ رہتے ہوئے بھی مسلح جدوجہد کے ذریعے مغل سامراج اور فیوڈل ازم دونوں سے بھڑ جانا اس تحریک کو یوٹوپیا سے تقریباً تقریباً نکال دیتا ہے۔

اس تحریک کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس طویل عوامی جنگ میں کسی ایک انسان نے

بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ جی ہاں، اس انقلابی جنگ میں نہ کسی نے ہتھیار ڈالے، نہ کوئی جاسوس بنا، اور نہ کسی نے سلطانی گواہی کی لعنت گردن میں پہنی۔ انقلابی لوگ لڑتے رہے کٹتے رہے۔ توپوں سے سارا شہر برباد کر دیا گیا۔ آگ لگا کر ہر ذی روح بھسم کر دی گئی۔ لائبریری، مسجد، قرآن شریف، حدیث کی کتابیں سب شہید ہو گئیں۔ 24 ہزار انقلابی کٹ مرے، مگر ایک بھی واقعہ بزدلی کا نہیں ہے، مخبری کا نہیں ہے۔ افسوس! ہم تاریخ کے رجسٹر میں اتنی بڑی انقلابی جنگ کی اہمیت، اُس کے شایانِ شان درج ہی نہ کر سکے!!۔ چوبیس ہزار کے قربان ہونے کا بالکل بھی افسوس نہیں، ان کی اس شہادت کے قصے کے مٹ جانے کا غم ہے۔ دکھ ہے کہ اس قصے کو محفلوں میلوں ماتموں میں دھرایا نہیں جاتا۔ رات کو سوتے وقت کوئی باپ اپنے بچوں کو اس بڑے واقعہ کی کوئی کہانی نہیں سناتا۔

ہاں، جیسا کہ ہوتا ہے کلہوڑے گئے، مغل گئے، ٹالپر گئے، انگریز گئے، اور اس کے بعد دیسی لوگ خود مختلف یونیفارموں میں حکمران بنے۔ مگر انہیں کوئی نہیں جانتا، اُن کا تذکرہ کوئی نہیں کرتا۔ لیکن صدیاں بیت جانے کے بعد بھی ضلع ٹھٹھہ کے جھوک شریف میں موجود شاہ عنایت شہید کے مقبرے کو کسانوں کی آزادی کی آواز سمجھا جاتا ہے۔ اور لوگ دور دور سے آ کر ان کی زیارت پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں(27)۔ اور اگر اُس دور کے یزیدوں جابروں کا تذکرہ آتا بھی ہے تو وہ جھوک جنگ میں مکار، فریبی، قرآن شکن دشمن فریق کے حوالے سے آتا ہے۔............ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہے گا۔

ایک دلچسپ بات شہیدوں کے اس قبرستان کی خصوصیت ہے کہ آپ وہاں سے خواہ ایک ولی اللہ سے روحانی فیض لینے جایئے یا ''مارس'' میدان جان کر شہدا کی اجتماعی قبروں کو تعظیم پیش کرنے جایئے، آپ خود سے یہ سوال کیے بنا رہ نہیں سکتے کہ ''میں کون ہوں؟ کس صف میں ہوں؟ کس کے ساتھ ہوں؟............ شہیدوں کے ساتھ ہوں یا قرآن شکنوں کے ساتھ؟'' یہ سوال بے شک جامع انداز میں ابھرے یا غیر واضح اور بے ساختہ طور پر، مگر چوبیس ہزار انسانوں کی شہادت اپنی وجوہات کی طرف ضرور متوجہ کرتی ہے۔ (اسی لیے تو حکمران قلندر بادشاہ اور بھٹائی سائیں کے مقبروں پر جشن

منا منا کرعوام الناس کا رخ شاہ عنایت کے روضہ پر جانے سے موڑتے رہتے ہیں)۔

ابھی شاہ عنایت کی جدوجہد کا قصہ ختم نہیں ہوا۔ دیکھیے نا، قربانی کے لیے تو موزوں ترین ہستی چُنی گئی تھی۔ تو بھلا اس سے عام انسانوں والا سلوک کیوں ہو؟ وہ عام انسان تو تھا نہیں وہ تو انقلابیوں کا انقلابی تھا، عاشقوں کا عاشق تھا، کمیونسٹوں کا کمیونسٹ تھا، شہیدوں کا شہید تھا۔ چنانچہ شاہ عنایت شہیدؒ کے سر کو نیزے پر چڑھا دیا گیا اور نیزہ بلند کیے ہوئے شہیدِ انقلاب کا سر پورے ٹھٹھہ شہر میں پھرایا گیا تھا۔ (کس قدر سر بلند ہوتے ہیں عوامی شہید!!)۔

شہید کا سر عوام الناس کے اندر خوف و ہراس پھیلانے اور بغاوت و انقلاب کو عبرت بنانے کی خاطر ایک ایک گلی ایک ایک محلّہ گھمایا گیا۔ (پاگلو! شہید اپنے عوام کو اپنا دیدار کرانے تم سے ہی یہ کام لیا کرتے ہیں۔ محبِ وطن لوگ اپنے وطن کی گلیوں کا آخری دیدار یوں بھی کرتے ہیں! آخری دیدار تو زندگی بھر یاد رہتا ہے۔اور یہ عام آدمی کا آخری دیدار نہیں تھا، شہیدِ شہید اں کا آخری دیدار تھا)۔

جاگیرداروں کا انتقام پھر بھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔ غصہ اب بھی سرد نہ ہوا۔ ابھی کمینگی مکمل دُھت نہ ہوئی، ابھی جَور کے تالاب سوکھ نہ گئے، ابھی الم ختم نہ ہوا۔ ابھی ستم تھما نہیں۔ ابھی سَم کی قدح میں تلچھٹ باقی تھی۔ ابھی قربانی کا اَنت نہ آیا۔ ابھی تو سوئے دار ہی ہو آئے تھے، کوئے یار تو دو قدم اور آگے تھا۔ چنانچہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ نے عبرت کو مزید گہرائی و گیرائی دینے کا کہا۔ لہٰذا دشمن نے شہیدوں کے سردار کا سر ٹھٹھہ سے دہلی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا، وہی نیزے کی انّی، وہی نیزے کی بلندی اور وہی سرِ شہیداں کا سر بلند سر۔ اب کے اِس سر کے سفر کا دورانیہ 48 دن کا تھا۔ افتخار و انکار بھرا سر علاقوں کو چیرتا رہا، دروں نالوں پہ جھٹکے کھاتا موسموں کو بھگتتا رہا، تماشا بنتا رہا، تکریم بھرے دلوں روحوں کے اجتماعات کھینچتا رہا، سنگِ میل بنتا رہا، نقطہ دشنام، مرکز الزام بنتا نشانِ منزل ہوتا رہا............

مگر عوامی مقبولیت حاصل ہو تو روایتیں بنتی ہیں، کہانیاں منیوفیکچر ہوتی ہیں، عقیدے بنتے

ہیں۔ ان روایتوں، کہانیوں اور عقیدوں کے مطابق اِن 48 دنوں کے سفر میں یہ نہ جھکنے والا سر چُپ نہ رہا۔ یہ قرآنی آیتیں اور حافظ کے اشعار پڑھتا رہا اور اپنی شاعری خلق کرتا رہا۔ حافظ شیرازی کے جن اشعار کو یہ ''سر'' سنا رہا تھا اُن میں سے کچھ ''دلپت دل دریاہ'' میں درج کی گئیں:

سردر قدم یار فدا شدہ چہ بجا شد

ایں بارگراں بود ادا شدچہ بجا شد

من سرّخدایم بہ سرخام چہ مطلب

سرّمن بہ سرّ خود بخدا شدچہ بجا شد

دود دل من حلقہ زدہ بر سرا فلاك

دودِدل ما حلقہ نما شدچہ بجا شد

ازخون دلم گشت چناں اسم انگشت

خون اسم ما انگشت نما شدچہ بجا شد

پروائے نہ داریم ازیں جسم گراں سر

چوں جسم فنا بود فنا شد چہ بجا شد

ھاتف بہ ندادا دمبارك زو صالم

خوددم ھم ما بود ندا شد چہ بجا شد

دلپت رام ''دلپت دل دریاہ'' (28)

میں جی آپ دلوں میں رہیں تو آپ کا بے دھڑ کا سر بولتا ہے۔ شہیدوں کا سر بولتا ہے۔ شہید شہید ہو کر بھی شاعری کرتا ہے۔ شاہ کے بے جان سر کی اس شاعری کو ''بے سرنامہ'' کا معتبر نام دیا گیا ہے۔ شایانِ شان سر ہی ایسی ''بے سرنامہ'' نامی مثنوی کہہ سکتا ہے۔

اُس کی مثنوی ''بے سَر نامہ'' میں اُس کی تحریک اور اس میں دی گئی قربانیوں کا ذکر موجود ہے۔ سندھی کے مشہور صوفی شاعر بیدل نے ''مثنوی دلکشا'' میں شاہ کی اِس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ (29)

کہتے ہیں کہ دھڑ سے جدا کیے ہوئے اس سرِ مبارک نے کل سات سو اشعار کہے تھے مگر وہ تقریباً سارے کا سارا کاغذ وقرطاس سے بے نصیب رہا............اور یوں اذہان سے گم ہوگیا(30)۔محض ایک دوانتخاب کہیں کہیں شائع ہو چکے ہیں۔جن کا ذکر ڈاکٹر محمد علی مانجھی صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں، اور محبوب علی چنانے اپنے مضمون ''شاہ شہید صوفی'' (مورسندھی، صفحہ 146) میں کیا ہے۔ وہی کچھ ہم یہاں نقل کر پائیں گے کہ ہمارا علم ابھی تک معلومات کے چند ہی سرچشموں کی رسائی تک محدود ہے:

من بغیر تو نه بینم در جهان، قادرا پروردگارا جاوداں

چوں بجز تو نیست در ھر دو جهاں، لا جرم غیرے نبا شد درمیاں

من ترا دانم ترا، بینم ترا، خود ترا کئے غیر باشد اے خدا

اولی و آخری تو اے احد، ظاهر و باطنی و بے عهد

هم نهان و هم عیان پیدا توئی، هم درونِ گنبدِ خضرا توئی

مگر ہم جانتے کہ جس خوبصورت آرٹسٹ نے ''بے سرمانہ'' نامی مثنوی بنائی، اس نے اس تحریک کے اغراض ومقاصد، اس جنگ کا رپورتاژ، فتح کے جشن اور شکستوں کی پژمردگی بہت فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہوگا۔

لیکن ایک نوٹ کرنے کی بات ضرور ہے؛ شاہ عنایت کے بارے میں جس نے بھی قلم اٹھایا خواہ فارسی میں یا سندھی واردو میں، وہ خواہ شاعری تھی یا نثر، ہر ایک نے اُس کے کٹے ہوئے سر سے زیادہ باتیں کہلوائیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اس عالم فاضل نے اچھی خاصی عمر پائی۔ ایک کمیون کی تشکیل کی۔ اسے کامیابی سے چلایا۔ مقامی جاگیرداروں اور پیروں ملاّؤں سے کئی برسوں تک الجھا رہا۔ دو تین جنگیں لڑیں، جس میں مقامی جاگیرداروں کے علاوہ مغل افواج کی سپر پاور فوج بھی تھی۔ چار ماہ تک محاصرے میں لڑتے رہے۔ افواج کی کمان، وعظ ونصیحت............ یہ سب کچھ اگر اکٹھا کیا جائے تو کئی جلدیں بنتی ہیں مگر اس زندہ زبان کی بہ نسبت کٹے ہوئے سر سے زیادہ باتیں کروائی گئیں۔

مائتھالوجی نے حقائق کو بہت چھپایا، ہمارا بڑا نقصان ہوا۔

بہر حال، شاہِ شہدا کا مبارک سر دہلی کے دربار تک بادشاہ کو تحفے کے بطور پہنچادیا گیا۔ سروں کے تحفے مغل بادشاہوں کے پسندیدہ تحفے ہوا کرتے تھے۔ وہ خواہ اپنے بھائی کے کیوں نہ ہوں۔ (اقتدار کاٹے ہوئے سروں، نکالی ہوئی آنکھوں کے تحفوں کی وصولیابی کے بغیر ممکن کہاں ہوتا ہے!!)۔

کہتے ہیں کہ وہاں اپنے اثر ورسوخ سے اجمیر کے خلیفوں نے یہ عظیم الشان سر حاصل کیا اور اُسے شاہ عنایتؒ کے فقیروں کے حوالے کیا جنہوں نے اسے تعظیم وتکریم کے ساتھ واپس جھوک پہنچادیا۔

آج بھی شاہ عنایتؒ کے روضے اور گنبد سے باہر سنگِ مرمر کا ایک خوبصورت چھوٹا پلیٹ فارم بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں اُس بڑے انسان کا تعظیم بھرا سر تدفین سے قبل وہاں رکھ دیا گیا تھا۔ (میں نے اُس ''سرجاہ'' کے سامنے بھی اپنا ناچیز سر خم کیا)۔

آیئے میر علی شیر قانع ٹھٹھوی کے وہ محترم الفاظ ہم بھی یہاں نقل کرتے ہیں، (اور آپ بھی اُن کا ورد کریں) جو اس نے شاہ کی شہادت کے 44 سال بعد استعمال کیے تھے:

" شیخِ حق شناس، شریعت اساس، آهوئے صحراگردطریقت، خمخانهِ وحدت، جوشِ حقیقت، ساقیِ سرمست، بزمِ ارشاد، ساغرِسرشار، بادهِ جواد، آئینهِ معرفت مجردی، رهنمائے ملكِ بے خودی، ازکثرتِ یکتائے گزیں، بمحفلِ خلوت نشیں" (31)۔

ایک بات میرے لیے البتہ نئی ہے۔ وہ یہ کہ سندھ کے تقریباً سارے (اور بلوچستان کے بھی اکثر) اولیا اپنا روحانی اور فلسفیانہ سلسلہ وہیں، شاہ عنایت کے جھوک شریف سے جوڑتے ہیں۔ سب کی جڑیں وہیں سے پھوٹی ہوئی ہیں۔ اتنے بڑے نام کمائے ہوئے لوگ، شہرت و دوام کی چوٹیوں تک پہنچے ہوئے لوگ، ہزاروں معتقد اور مریدوں کے آقا لوگ خود اِسی حوضِ آگاہی کے پیے

ہوئے لوگ ہیں۔اِن کو سلام، اِن کے اتالیق پہ سلام۔

میرا مطالعہ اتنا وسیع نہیں ہے کہ میں شاہ عنایتؒ کے مکتبِ فکر سے وابستہ ان ولیوں کی شاعری میں شاہ شہید کی سماجی معاشی تعلیمات کی تفصیل معلوم کرسکوں۔مگر یہ بات جان سکا ہوں کہ سائیں رکھیل شاہ، صادق فقیر، بیدل فقیر، روحل فقیر، مصری شاہ، فقیر ولی محمد لیغاری، بیکس فقیر، اور مراد فقیر اُنہی کے مکتب کے درویش ہیں اور پائے کے شاعر گزرتے ہیں۔حتیٰ کہ سائیں رکھیل شاہ کو بیعت کرنے کے لیے بھی بلوچستان سے جھوک شریف میں حضرت شاہ عنایت شہید کی درگاہ جانے کا حکم ہوا تھا۔ہمارے جیکب آباد کے ممتاز درویش اور بلوچی شاعر پہلوان فقیر بھی (ڈومبکی بلوچ) اسی مکتبِ فکر سے ہیں۔اِن سب کے کلام میں موجود سماجی تعلیمات کے بارے میں ابھی محققوں کو بہت سارا کام کرنا ہے۔

چوش نہ بیت......

(ایسا کبھی نہ ہوگا......عطا شاؔد)

ہم ابھی تک شاہ عنایت کی جسمانی اذیتوں کا تذکرہ کرتے آئے ہیں۔مگر دانشور کی اصل اذیت جسمانی تھوڑی ہوتی ہے۔دانشور کو ایذا دینا ہو تو اسے روحانی اذیت دے دو............ یہ بات ہر دانش دشمن، ہر تفکر مخالف جانتا ہے۔خواہ وہ اکیسویں صدی کے ترقی یافتہ مغرب کا ہو یا سولہویں صدی کے سندھ و بلوچستان کا۔لہٰذا جھوک کا جاگیردار بھی جانتا تھا۔

شاہ عنایت کا اصلی، اذیت ناک اور طویل ترین امتحان تو اُن کے مقبرے کی تعمیر کے بعد شروع ہوا۔اُس کا سر دھڑ سے جدا کرنے کا مرحلہ گزرا تو اب اُس کے روح کو تڑپا دینے کی سزا شروع ہوئی۔اب اُس سے اُس کی تعلیمات کو الگ کرنے کی کاروائی کا منظّم آغاز ہوا۔اُس کا فلسفہ، اور اُس کی زندگی کا جوہر اُس کے وجود کا حصہ رہنے نہ دینے کی کاروائی شروع ہوئی۔جس طرح کہ ہندوستان بھر میں مہاتما بدھ نے برہمن ازم کی چولیں ہلا دی تھیں۔اور پہلی بار ایک ایسے مذہب کی بنیاد ڈالی جس میں خدا کا وجود نہیں تھا۔چرچ اور مندر نہ تھا، سچ اور انسان کے بیچ پنڈت ملاّ نہ تھا۔بدھ کے مذہب کی

وجہ سے برہمنوں کی بادشاہی ختم ہوگئی تھی اور انسان آزاد ہوگیا تھا تاکہ وہ خود غور وفکر کرے اور ابدی سچ تلاش کرے۔ اور جب برہمنوں کو مکمل شکست ہوئی اور مہا تما بدھ کی تعلیمات کا بول بالا ہوا تو انہوں نے ایک نئی چال چلی۔ انہوں نے مہاتما بدھ کی مخالفت ترک کر دی اور اُس ہی کو اپنے دیوتاؤں میں لا شامل کر دیا۔ یعنی اُس کو اپنا بنا کر اس کی تعلیمات کا مغز نکالنے میں لگ گئے۔

یہی کچھ یہاں شاہ عنایت شہید رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ ہوا۔

جاگیرداروں، پیروں اور حکمرانوں نے شاہ شہید کے نظریاتی اثرات ختم کرنے کے لیے اُس کی مخالفت یکسر ترک کر دی۔ اُس کا تذکرہ ہی بند کر دیا۔ دانشور کی ابدی موت یہ ہوتی ہے کہ اس کا نوٹس نہ لیا جائے۔ لہٰذا شاعنایت کا تذکرہ بند۔ نہ اس پہ شاعری ہوئی، نہ ضرب الامثال بنے اور نہ اساطیری قصے تعمیر ہوئے۔ مکمل بلیک آؤٹ، مکمل بائیکاٹ۔

لے دے کے رہ گئی اُس کی قبر، اور اس کے ساتھیوں کی اجتماعی قبریں (گنجِ شہیداں) سو اب انہیں بے اثر کرنا تھا۔ چنانچہ فیوڈل ازم کو اب ایک قبر کو بے اثر کرنے کی فکر لاحق ہوگئی۔ اور ان کا یہ کام دوروپے کی اگربتیوں نے پورا کر دیا۔ اگربتیاں اس برصغیر میں سوچ و عقل پہ معطر دھوئیں کا وہ دبیز تہہ چڑھاتی رہی ہیں کہ جس سے اِس خطے میں آنے والا ہر نیا فلسفہ، ہر نیا تخیل، اور ہر نئی ایجاد گھٹ گھٹ کر مرتی رہی ہے۔ شاہ عنایت شہید کے فلسفے کو بھی بڑی خوبی سے اگربتی کے دھوئیں میں لپیٹ کر دفن کر دیا گیا۔ (لوبان کے دھوئیں نے اولین سماجی انقلاب کے داعی حضرت یسوع مسیح کے کمیون کے نظریے کا گلا گھونٹ دیا تھا، اور اگربتی کے دھوئیں نے شاہ عنایت کے سوشلزم کو)۔

اب اُس کا دربار ہے۔ اُس پہ بڑی بڑی قیمتیں چادریں ہیں۔ چادروں پہ نقش ونگار ہیں۔ نقش ونگار میں آیتیں دعائیں ہیں۔ بس اُس کا فلسفہ نہیں ہے۔ مزار پہ قیمتی کپڑے ڈالنے، اگر بتیوں، عطر وخوشبوؤں، چاندی کے دروازوں کے بوجھ سے عوام الناس کے اذہان ماؤف کر کے انہیں درود، وظیفہ، ختم ونذر، خیر خیرات پر لگا دیا گیا۔ وہاں اب شاہ کی خود اعتمادی سکھا دینے والی عوامی جدوجہد کے بارے میں کچھ نہیں بولا جاتا۔ بلکہ اس طرح کے صبر کی تلقین کی جاتی ہے جس سے

موت کا ذائقہ چھلکتا ہے:

میری لکڑی کی روٹی میری بھوک ختم کر دیتی ہے
جنہوں نے چپڑی روٹی کھائی ہے وہ زیادہ دکھ سہیں گے

یا............

فریدا روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پینا چاہیے
کسی دوسرے کی چکنی چپڑی کو دیکھ کر جی کو ترسانا نہیں چاہیے

موت ہے یہ فلسفہ۔ انسان کو لکڑی کی نہیں گندم کی روٹی چاہیے۔ اور وہ بھی روکھی سوکھی نہیں گھی شکر سے چپڑی روٹی چاہیے۔

صبر وسکون کی تلقین جگالی کرنے والے سجادہ نشینوں کو خاص متبرک لباس میں ملبوس کروا کر انہیں نرینہ اولاد بخشنے، تنگدستی ہٹانے اور مرادیں پوری کرانے کی اتھارٹی بنا دیا گیا۔ عنایت زندہ نہ خریدے جا سکے تو اُس کے مقبرے کے پائیں طرف پیسہ نچھاور کر کے دل کی مرادیں خرید لینے کی روایت چل پڑی ہے۔ اب وہاں عرس میں انصاف اور سچ کے نظریے سے بھٹکا کر اس مقدس مقام کو لنگڑوں لولوں اپاہجوں مفلوجوں، بھکاریوں چرسیوں بھنگیوں، لونڈے بازوں، سیاستدانوں کے ہوسٹل میں بدل دیا گیا۔ جھوک کی جنگ، 24 ہزار انقلابیوں کی شہادت، اور اجتماعی کاشتکاری کا نیا نویلا نظریہ مدھم ہو ہو کر ختم ہو چلا ہے۔ اب وہاں ہر سال عرس منعقد ہوتا ہے، دھمال وگھنگرو اور عارفانہ کلام ہوتا ہے۔ آج کے ''قرآنی'' وزیر وصدور آ کر مزار کو اپنے ناپاک اور ظلم سے اٹے ہاتھوں سے غسل دیتے ہیں، یہ سند یافتہ دروغ گو شاہ شہید کو اپنی صفوں کا بتاتے ہیں۔ ریڈیو ٹی وی پہ ان کے عرس کی لاش دکھاتے ہیں............ اور یوں اُن کے فلسفے کو اِس شور وغل کے اندر، ناک وآنکھ و کان کی لذتوں میں ڈبو دیتے ہیں۔ ہر سال شاہ عنایتؒ کی روح کی اذیت کا یہ تماشا ایک نہیں دو نہیں بلکہ تین سو سال سے جاری ہے۔ قربانی کے لیے موزوں ترین اور فربہ ترین دنبہ!

اور میں جب فروری 2010 میں وہاں اسی قصبے جھوک میں شاہ عنایت کے اپنے مزار کے باہر لوگوں سے اس جنگ اور اس کے اسباب کی تفاصیل معلوم کرتا رہا تو مجھے گاؤں والوں نے ایسی نظروں سے دیکھا جس طرح 'گلستانِ سعدی' میں گدھوں کو دیکھا جاتا تھا۔ آپ کہیں سے بھی جھوک شریف کی طرف جائیں آپ کو راستے میں کوئی بورڈ، کوئی سنگِ میل نہیں ملے گا جو آپ کو جھوک شریف کی سمت اور مسافت بتائے۔ دربار میں داخل ہو جائیں تو سب سے پہلے ایک احمقانہ اور ''عنایت دشمن'' بورڈ ملے گا جس پر لکھا ہے: '' عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے''۔ (عورت ایک ایسی بلا بنادی گئی ہے جسے سیکڑوں سالوں سے ہم کسی خانے میں فٹ ہی نہیں کر پا رہے۔ ایسا خطرہ تو ڈرون سے بھی نہیں جتنا کہ انسانی تاریخ میں عورت کو قرار دیا گیا ہے۔ شاہ عنایت کا روضہ مبارک اور کسی بھی اشرف المخلوقات کا داخلہ ممنوع؟ یار، شاہ کے پیروکاروں سے زیادہ پالتو اور ہڈحرام مخلوق میں نے نہیں دیکھی)۔ دربار میں شاہ کے بارے میں، اور اُس کی تعلیمات کے بارے میں کچھ مواد موجود نہیں ہے۔ جھوک بھر میں اُس کے بارے میں کوئی پمفلٹ، کوئی بروشر، کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ خود ٹھٹھہ شہر میں کوئی کتاب گھر نہیں جہاں شاہ عنایت کا فلسفہ ملے۔ علاوہ ازیں اتنی بڑی اور طویل جنگ کے بارے میں (یقینی طور پر موجود) لوک ادب کو بہت استادی کے ساتھ منظرِ عام سے ہٹادیا گیا۔ یوں ہر طرح کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ ایک عام پیر بن کر رہ جائے جو بے اولادوں کو اولادیں دے، بگڑے کام بنائے، سمگلروں کے رزق میں برکت دے..........

ہمارے ہاں سیکڑوں مُرداروں، غاصبوں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کو ہیرو بنا کر نصاب میں پڑھایا جاتا ہے، بے شمار حملہ آوروں کے حملوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ مگر محنت کاروں کے حق کے لیے سر کی قربانی دینے والے شاہ عنایت شہیدؒ کے نامِ گرامی کا ذکر ہماری سکولی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ کوئی یونیورسٹی، کالج، سڑک، پارک اُس کے نام کی نہیں ہے۔ کوئی چیئر، کوئی تحقیقی مرکز شاہ عنایت سے منسوب موجود نہیں ہے۔ اُس پہ کوئی شاعری، کوئی تحقیقی کتاب وجود نہیں رکھتی، کسی نے بھی اپنی کتاب اس کے نام منسوب نہ کی۔ اُس پہ کسی بھی رسالے میں کبھی کوئی خصوصی ایڈیشن نہ

نکلا............سماج کے نہیں بلکہ مرگھٹ کے باشندے ہیں ہم۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہ عنایت شہیدؒ کی ساری انقلابی روح کھرچ کر باہر نکالنے کی اِن ساری فیوڈل اور رجعتی کوششوں کے باوجود وہ شاہ عنایت شہید کے نامِ گرامی سے ''شہید'' کا لفظ نہ نکال سکے اور نہ ہی روضہ کے احاطے میں موجود ''گنجِ شہیداں'' نامی سات بہت بڑی اجتماعی قبروں کی تجلی و نور کو روکا جاسکا ہے۔

.... اور ''شہید'' لفظ کی وجہ تسمیہ، تو زائرین ایک دوسرے سے پوچھیں گے ہی ....تا روزِ قیامت!!۔

حوالہ جات

1-راشدی، حسام الدین۔شاہ عنایت شہید جی سوانح جاماخذ۔مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی 2003۔سندھی ساھت گھر۔حیدرآباد۔صفحہ 39

2۔رشید بھٹی۔2010۔تصوف اور کلاسیکی سندھی شاعری۔سندھی ادب سنگت۔صفحہ 26

3۔سبطِ حسن۔نویدِ فکر۔2008۔مکتبہ دانیال کراچی۔صفحہ 186

4۔راشدی، حسام الدین۔ایضاً صفحہ 37

5-خان، احمد نبی۔دیوانِ داراشکوہ۔سن اشاعت ندارد۔ادارۂ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونیورسٹی، لاہور صفحہ 55

6-صوفی، حضور بخش۔شاہ عنایت شہید۔مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003 سندھی ساھت گھر، حیدرآباد۔صفحہ 170۔

7۔مانجھی، محمد علی۔صوفی شاہ عنایت شہید اَیں سندس سلسلے جا شاعر۔2010۔ثقافت کھاتو، حکومت سندھ۔ صفحہ 130

8-راشدی، حسام الدین۔شاہ عنایت شہید جی سوانح جاماخذ۔صفحہ 39

9- مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003۔سندھی ساھت گھر، حیدرآباد۔ صفحہ 125

10۔صوفی، حضور بخش۔شاہ عنایت شہید۔صفحہ 186

11- بھٹی، رشید۔تصوف اور کلاسیکی سندھی شاعری۔2010۔سندھی ادبی سنگت۔صفحہ 29

12-سید، سبطِ حسن۔نویدِ فکر۔1985۔مکتبہ دانیال کراچی۔صفحہ 204

13- کوہیار، منظور/ننگر چنا۔جو کھیڑے، وہ کھائے۔ماہنامہ سنگت جولائی 2013

14-قانع ٹھٹھوی، میر شیر علی ''مقالات الشعراء'' صفحہ 31۔یہ حوالہ ڈاکٹر محمد علی مانجھی نے اپنی کتاب: صوفی شاہ عنایت شہید اَیں سندس سلسلے جا شاعر۔2010۔ثقافت کھاتو، حکومت سندھ کے صفحہ 221 پر دیا ہے۔

15-صدیقی، آفاق۔پروفیسر۔شاہ عنایت شہید۔صوفی پبلیکیشن۔مارچ 2006۔صفحہ 73

16-خدایار خان، خط بنام پسر۔جھوک واری جنگ جے میدان تاں۔مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003۔سندھی ساھت گھر۔حیدرآباد۔صفحہ 217

17-راشدی، حسام الدین۔سندھ جو پہریوں زرعی سدھارک۔مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003۔سندھی ساہت گھر، حیدرآباد۔صفحہ 82

18۔صوفی، حضور بخش۔شاہ عنایت شہید۔صفحہ 202

19-ملتان کے صوبیدار سید حسین خان کے بیٹے کا میدانِ جنگ سے خط: ''جھوک واری ویڑھ''۔مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003۔سندھی ساہت گھر، حیدرآباد۔صفحہ 219۔

20- مہر، غلام رسول۔صوفی شاہ عنایت رحمت اللہ علیہ۔جناب مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003۔سندھی ساہت گھر۔حیدرآباد۔صفحہ 31

21-راشدی، حسام الدین۔شاہ عنایت شہید جی سوانح جاماخذ۔صفحہ 43۔64

22۔صوفی حضور بخش۔صوفی شاہ عنایت شہید۔صفحہ 170

23- بھٹی، رشید۔تصوف اور کلاسیکی سندھی شاعری۔2010۔سندھی ادبی سنگت۔صفحہ 31

24- سید، سبطِ حسن۔نویدِ فکر۔1985۔مکتبہ دانیال کراچی۔صفحہ 412

25- سید، جی ایم۔شاہ عنایت اللہ۔مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003۔ سندھی ساہت گھر، حیدرآباد۔صفحہ 103

26-صوفی حضور بخش۔صوفی شاہ عنایت شہید۔صفحہ 112

27- سجن بھٹو۔سندھ کا زرعی نظام اور ہاری جدوجہد۔ریسرچ فورم جلد 5، اکتوبر 1989۔کراچی صفحہ 11

28۔شاہ عنایت شہید اکیڈمی۔2011۔صفحہ 27

29- چنا، محبوب علی۔شاہ شہید صوفی۔مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب ''سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003۔ سندھی ساہت گھر، حیدرآباد۔صفحہ 146

30- سوبھراج نرمل داس۔جھوک شریف۔مور سندھی کی مرتب کردہ کتاب: سندھ جو سوشلسٹ صوفی۔2003۔سندھی ساہت گھر حیدرآباد۔صفحہ 239

31-راشدی، حسام الدین۔شاہ عنایت شہید جی سوانح جاماخذ۔صفحہ 39

(*) فیڈل کاسٹرو کے الفاظ کہ ''تاریخ میری بے گناہی کی منادیاں کرتی پھرے گی''۔یہ فقرہ انہوں نے اُس عدالت میں کہا تھا جب وہ مونکیڈا بغاوت کی ناکامی پر گرفتار کیا گیا تھا۔